انشا پرداز

تحریر و تحقیق : ساجد امجد

ذوق کے عناصرِ خمسہ میں ایک اہم نام جس کی زبان پروری اور انشا پردازی مسلّم الثبوت ہے۔ وہ حالی، شبلی، سرسید کے ہمعصر اور غالب و ذوق کا زمانہ دیکھ چکے تھے۔ جدید اردو نظم کی ترقی و ترویج میں خصوصی حصہ لیا، اردو نثر کو ایک نئے اسلوب و آہنگ سے روشناس کیا۔ فن تاریخ نگاری میں ممتاز مقام حاصل کیا۔ اپنے محترم استاد محمد ابراہیم ذوق کی شاگردی کا حق ادا کر دیا۔ ورنہ آج شاید ذوق اس مقام پر فائز نظر نہ آتے جہاں ہیں۔

بے مثل انشا پرداز شمس العلماء محمد حسین آزاد کی سرگزشت

زمانہ فراغت کے تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا لیکن اس تکیے میں بے سکونی کی روئی بھری ہوئی تھی جو کسی وقت بھی بے چینی کی چنگاریوں میں تبدیل ہو سکتی تھی۔

اکبر شاہ ثانی کے بعد بہادر شاہ ظفر تختِ شاہی پر جلوہ افروز ہو چکے تھے۔ مجبوریوں اور بے چارگیوں کے کشکول میں شاہی ٹھاٹ باٹ اپنی آخری بہار دکھا رہے تھے۔

انگریزوں کی چیرہ دستیاں روز بروز بڑھتی جا رہی تھیں لیکن شاہی سرپرستی میں تمدنی بہار ابھی تک اپنا رنگ جمائے ہوئے تھی۔ مدرسے آباد تھے، مشاعروں کی محفلوں پر شباب تھا۔ تشنگانِ علم کے لیے یہ شہر، شہرِ بغداد تھا۔

کروٹیں بدلتے ہوئے وقت نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ اب فارسی کے دامن میں اردو کے پھول کھلنے کا وقت آگیا ہے۔ فنِ طباعت کی ترقی نے علم و فضل کی اشاعت کو تیز تر کر دیا تھا۔

بہادر شاہ ظفر کی تخت نشینی سے ایک سال قبل ۱۸۳۶ء میں دلی میں رہنے والے ایک شخص مولوی محمد باقر نے دہلی اردو اخبار کی بنیاد رکھی جو شمالی ہند کا پہلا اور ہندوستان کا دوسرا اخبار تھا۔ اس سے اگلے سال سرسید احمد خان کے بڑے بھائی سید محمد خان نے سید الاخبار کا اجرا کیا۔ اس کے بعد صادق الاخبار اور گلِ رعنا بھی سامنے آگیا۔

ان اخباروں کی وجہ سے دلی کے عوام میں بیداری کی لہر دوڑ گئی اور وہ دنیا کے حالات سے باخبر ہونے لگے۔ انہی اخباروں کی بدولت عوام کو سیاسی شعور ملا اور انہیں احساس ہوا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا بڑھتا ہوا اقتدار کتنی خطرناک چیز ہے۔ انہی اخباروں کی وجہ سے عمل اور ردِ عمل ایک ساتھ سفر کرتے ہوئے نظر آنے لگے۔ فراغت کے تکیے میں بے چینی کی چنگاریاں گرم ہونے لگیں۔

○☆○

مولوی باقر ایک علمی گھرانے کے فرد تھے۔ ابتدائی تعلیم سے فراغت کے بعد وہ میاں عبدالرزاق کے درس میں شرکت کرنے لگے۔ یہیں ان کی ملاقات شیخ ابراہیم ذوق سے ہوئی۔ یہ ملاقات پُرخلوص دوستی میں تبدیل ہو گئی۔ دونوں کو ایک دوسرے کے بغیر چین نہ آتا تھا۔

ذوق نے شاعری کا سنگھاسن سنبھالا اور مولوی باقر نے دہلی کالج کی مدرسی اور بعد میں اخبار کا اجرا۔

دوستوں کی محفل میں بچوں کو لے جانے کا رواج نہیں تھا لیکن مولوی باقر اپنے بیٹے محمد حسین کی ذہانت کو دیکھتے ہوئے کبھی کبھی اسے بھی اپنے ساتھ میاں ذوق کے پاس لے

جاتے تھے۔ اسے بھی یہ صحبت ایسی پسند آئی کہ ضد کرکے وہاں جانے لگا۔ ذوق کی محفل میں شاعری کے سوا کیا تھا۔ یہ بچہ ایک ایک کی صورت تکتا اور پڑھے جانے والے اشعار کو سمجھنے کی کوشش کرتا۔ اکتاہٹ اور بیزاری ایک پل کو بھی اس کے چہرے پر اپنی جگہ نہ بناتی۔

بن ماں کا یہ بچہ اپنی پھوپی کے دامنِ تربیت سے وابستہ تھا اور اپنے دادا مولوی اکبر کے ساتھ مکتب جایا کرتا تھا۔

مولوی باقر کاروباری آدمی تھے اس لیے انہیں اتنی فرصت کہاں تھی کہ محمد حسین کی نوشت وخواند کی طرف توجہ کرسکتے البتہ جب وہ مکتب کی تعلیم ختم کرچکا اور اپنی عمر سے زیادہ علم حاصل کرچکا تو اس کے شوقِ علمی کے چرچے ہونے لگے۔

ایک دن وہ گھر میں رکھے ہوئے اخبار کو پڑھتا بھی جاتا تھا اور خبروں پر تبصرے بھی کرتا جاتا تھا۔ اتفاق سے مولوی باقر کا گزر ہوا۔ اس کے بچے تلے تبصرے سن کر ان کے قدم رک گئے۔

"ارے بھائی' یہ پھوپی بھتیجے میں کیا سیاست ہورہی ہے۔"

"جایئے بھی آپ کو کیا" ان کی بہن نے کہا "آپ کو تو محمد حسین کی تعلیم کی کچھ فکر ہی نہیں۔ وہ اپنا شوق الا بلا کتابیں پڑھ کر پورا کرتا رہتا ہے۔ خود دہلی کالج کے مدرس رہ چکے' اخبار نکالتے ہیں' اب کچہری میں بیٹھتے ہیں' مولوی کہلاتے ہیں اور بیٹے کی فکر ہی نہیں۔ مجھے جو بنانا تھا' میں نے اسے بنادیا۔ اب آپ کی اولاد ہے آپ جانیں۔"

"تم کیا سمجھتی ہو۔ مجھے اس کی فکر نہیں ہے؟ ایک ہی تو بیٹا ہے میرا۔ میں نے اس کے لیے کیا سوچا ہے' یہ آکر بتاؤں گا۔"

وہ ان دنوں کلکٹر کے دفتر میں ملازم تھے اور اس وقت دفتر جانے کے لیے ہی تیار ہورہے تھے۔ اخبار پر ابھی ان کا نام نہیں چھپتا تھا۔ اخبار کی دیکھ بھال بھی دوسرے ہی لوگ کرتے تھے۔

وہ دفتر جانے کے لیے گھر سے نکل گئے تو ان کی بہن ان کی واپسی کا انتظار کرنے بیٹھ گئیں کہ دیکھو کب آتے ہیں اور کیا نوید سناتے ہیں۔

مولوی باقر دوپہر تک تو دفتر کے کاموں میں پھنسے رہے پھر اپنے اخبار کے دفتر میں پہنچ گئے۔ کچھ احباب وہاں آگئے تھے ان سے ملے پھر استاد ذوق کی طرف نکل گئے۔ چراغ جل چکے تھے کہ وہ گھر لوٹے۔

"لو بھائی' ہم نے محمد حسین کے بارے میں سوچ لیا کہ کیا کرنا ہے۔ ہم اسے دہلی کالج میں داخل کرائیں گے۔"

"اے لو! اسے وہاں داخل کراؤ گے؟ وہاں تو موئی انگریزی بھی پڑھائی جاتی ہے" محمد حسین کی پھوپی نے کہا۔

"اسی لیے تو میں اسے وہاں داخل کرا رہا ہوں۔ ویسے بھی جو انگریزی پڑھنا چاہتا ہے' وہ پڑھتا ہے۔ میں تو اسے مشرقی علوم کے شعبے میں بٹھاؤں گا۔"

"پھر یہی کالج کیا ضروری ہے؟"

"تم گھر میں بیٹھنے والی ہو' تمہیں کیا معلوم۔ اس کالج میں مشرقی علوم کے ساتھ ساتھ علوم جدیدہ کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ ضابطہ دیوانی' الجبرا' تاریخ اور جغرافیہ وغیرہ کی تعلیم حاصل کرکے طالب علم کلکٹر کا فقیر نہیں رہ جاتا۔ اب زمانہ بدل رہا ہے۔ ایک یہی کالج ہے جہاں قدیم وجدید کی آمیزش ملتی ہے۔ محمد حسین کے جوہر خوب کھلیں گے۔ جتنے لائق اساتذہ ہیں۔ اتنی ہی کارآمد تعلیم ہے۔"

"میں نے سنا ہے وہاں کا پرنسپل ہمیشہ انگریز ہوتا ہے۔"

"بھئی انگریزوں نے ادارہ قائم کیا ہے۔ پرنسپل تو انگریز ہوگا لیکن ایسے لوگوں کا تقرر کیا جاتا ہے جو مشرقی علوم کے ماہر ہوتے ہیں۔ بس میں نے سوچ لیا ہے' اسے وہیں داخل کراؤں گا۔ میاں ذوق کا بھی یہی خیال ہے۔"

"وہ شاعر آدمی' انہیں کیا معلوم؟"

"وہ شاعر ضرور ہیں لیکن قلعے سے ان کا تعلق ہے۔ بدلتے ہوئے حالات پر ان کی گہری نگاہ ہے۔ وہ جانتے ہیں' ہوا کس طرف کی ہے۔"

یہ بحث زیادہ طول نہ پکڑ سکی۔ اولاد تو ان کی تھی' پھوپی کو کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ محمد حسین دہلی کالج میں داخل ہوگیا۔

یہاں کے اساتذہ کی قابلیت اور ہم جماعتوں کی صحبت نے بہت جلد محمد حسین کے پوشیدہ جوہروں کو ابھارنا شروع کردیا۔

کالج کی طرف سے مضمون نویسی کا مقابلہ ہوا۔ عنوان تھا "اسلامی اور انگریزی حکومتوں کے تحت آزادیِ رعایا کے بارے میں کیا فرق تھا۔"

محمد حسین کو اخبارات کے مطالعے سے مضمون نگاری کا ڈھنگ آگیا تھا۔ ایک عام طالب علم کے مقابلے میں اس کے پاس معلومات کا خزانہ بھی زیادہ تھا۔ اس نے اس مقابلے کے لیے مضمون لکھا اور خوب لکھا۔ اس کے مضمون کو پہلے

انعام سے نوازا گیا۔

وہ جو ایک جھجک سی اس کے دل میں تھی، وہ نکل گئی۔ اسے یقین آگیا کہ وہ مضمون نگاری کر سکتا ہے۔ جب کالج میں ایک اور انعامی مقابلہ ہوا تو اس نے پھر مضمون لکھا۔ اس مرتبہ بھی اس کا مضمون سب سے بہتر قرار پایا۔

کالج کے علمی ماحول سے اس کی صلاحیتیں چمکنے لگی تھیں۔ اس ماحول کے ساتھ ساتھ استاد ذوق کا سایۂ عاطفت بھی اسے میسر تھا۔ ذوق کو صحتِ زبان کا خاص ذوق تھا۔ گفتگو میں لفظی بحثیں کرتے بھی تھے اور اشعار میں اس کا علمی اظہار بھی ہوتا تھا۔ ان کی صحبت سے اسے بھی الفاظ کی تراش خراش کا شوق ہوا۔ زبان دانی کا یہ جنون اسے ہر شام ذوق کی خدمت میں پہنچا دیتا۔ جب وہ ٹہلنے کے لیے نکلتے تو وہ بھی ساتھ ہوتا۔ ذوق باتیں کرتے جاتے۔ مضامین کتابی، خیالات علمی افادہ فرماتے اور وہ سنتا جاتا۔

ایک دن جو وہ ٹہلنے کے لیے نکلا تو ذوق، بادشاہ کے لیے غزل کہنے میں مصروف تھا۔

"تم بھی تو کچھ کہو" انہوں نے کہا۔

"میں کیا عرض کر سکتا ہوں۔"

"میاں اسی طرح آتا ہے۔ ہوں ہاں، غوں غاں، کچھ تو کہو۔ کوئی مصرع ہی سہی۔"

محمد حسین نے کچھ دیر سوچنے کے بعد ایک شعر موزوں کرلیا۔

آجائے اگر ہاتھ تو کیا چین سے رہیے
سینے سے لگائے تری تصویر ہمیشہ

"ہاں درست ہے" ذوق نے کہا۔ ساتھ ہی اس مسرت کا بھی اظہار کیا کہ وہ شعر کہہ سکتا ہے "تم شعر کیوں نہیں کہتے؟"

"کہتا تو ہوں، آپ کو دکھانے کی ہمت نہیں ہوتی۔"

"واہ، میاں! یہ اچھی کہی، اب کے آنا تو کوئی غزل لے کر آنا، ہم بھی تو سنیں۔"

اس کا میلان نثر کی طرف زیادہ تھا لیکن ذوق کی صحبت نے شاعری کا رنگ چڑھا دیا۔ اس نے اپنے لیے آزاد تخلص انتخاب کیا اور استاد کے ساتھ مشاعروں میں جانے لگا۔ تحقیق و تجسس اور زبان دانی کے شوق نے اسے ابتدا ہی میں قادر الکلام اور پختہ کار بنا دیا۔ تنقیدی نظر ایسی تھی کہ استاد ذوق انہیں اپنے اشعار سنا کر اس کی داد کے منتظر رہتے تھے۔

ذوق اپنا کلام آزاد کے والد کے پاس جمع کراتے تھے۔ آزاد نے جب شاعری کے خارزار میں قدم رکھا تو یہ بارِ گراں

سوانحی خاکہ

نام۔ ☆ ۔محمد حسین
تخلص۔ ☆ ۔آزاد
خطاب۔ ☆ ۔شمس العلما
والد۔ ☆ ۔مولوی سید محمد باقر
پیدائش۔ ☆ ۔۱۰ جنوری ۱۸۳۰ء
وفات۔ ☆ ۔۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء
مدفن۔ ☆ ۔لاہور، نزد گامے شاہ۔

اپنے ذمے لے لیا۔ اب استاد کا دیوان اس کے گلے کا تعویذ تھا کہ ایک دم کے لیے آنکھ سے اوجھل نہ ہوتا تھا۔ جہاں کہیں ان کا کوئی غیر معروف شعر سنتا، فوراً لکھ لیتا اور تصدیق کے لیے استاد کے پاس لے جاتا۔ کتنے ہی ایسے اشعار اور ادھوری غزلیں جو ذوق کو بھی یاد نہیں رہی تھیں، اِدھر اُدھر سے جمع کر کے دیوان میں داخل کردیں۔ شیفتگی اور عقیدت کی یہ وہ منزل تھی جس کے قدرداں خود ذوق بھی تھے لہٰذا وہ بھی ہر وقت اسے اپنے ساتھ لگائے رہتے تھے۔ ایک دن وہ حکیم آغا جان عیش کی ملاقات کو جا رہے تھے کہ آزاد بھی ساتھ ہولیا۔

حکیم آغا جان عیش خاندانی طبیب تھے۔ شیریں کلام، شگفتہ مزاج، ہر وقت یہ معلوم ہوتا تھا مسکرا رہے ہیں۔ ساتھ اس کے شعر کا عشق تھا۔ انہیں دیکھ کر آزاد کے دل میں خیال آیا کہ استاد کے بعد اگر کوئی استاد بنانے کے قابل ہے تو وہ یہی شخص ہے۔

یہ قبولیت کی کوئی ایسی گھڑی تھی کہ کچھ عرصے بعد ہی ذوق کا انتقال ہوگیا۔ میاں ذوق اس کے لیے صرف استاد نہیں تھے، شفقت کی ایسی چھاؤں تھے کہ ان کے اٹھتے ہی اس کے سر سے سایہ اٹھ گیا۔

استاد کے بعد ان کا دیوان ہی اس کے لیے سب کچھ تھا۔ کسی خبطی کی طرح مسودے کے کاغذات کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہتا۔ پھر ایک دن اسے خیال آیا کہ استاد کی یہ نشانی کب تک کاغذوں میں بند رہے گی۔ زمانے کی آندھی اسے ورق ورق بکھیر دے گی۔ اسے تو خوشبو کی طرح پھیلنا چاہیے۔ اسے ترتیب دے کر شائع کرانا چاہیے۔

شیخ اسمٰعیل، ذوق کے فرزند کے بغیر یہ کام مکمل نہیں ہو سکتا تھا۔ دونوں نے مل کر کلام کو ترتیب دینا چاہا۔ مصیبت

یہ تھی کہ ذوق نے کبھی اپنے کلام کی حفاظت نہیں کی تھی۔ کچھ کلام آزاد کے پاس محفوظ تھا لیکن اس سے بھی زیادہ منشوں اور صندوقوں میں بھرا پڑا تھا۔ اس میں شاگردوں اور بادشاہ کی غزلیں بھی مل جل گئی تھیں۔ ان میں سے ذوق کے کلام کو پہچاننا اور اسے الگ کرنا آسان کام نہیں تھا۔ کچھ ادھوری غزلیں تھیں۔ ان کے اشعار تلاش کرنا آسان کام نہیں تھا۔

شیخ اسمٰعیل نے تمام اثاثہ ان کے سامنے لاکر رکھ دیا۔

"یہ کام تم ہی کرسکتے ہو۔ میری مدد درکار ہو تو میں حاضر ہوں۔"

آزاد نے تمام پرزے سمیٹے اور گھر چلا آیا۔ اب اسے ان غزلوں کو صاف کرنا اور الحاقی کلام کو الگ کرنا تھا۔

یہ کام نہ تو آسان تھا اور نہ جلدی میں ہونے والا لیکن ایسا ضرور تھا کہ آزاد کا عشق اسے آسان بنا سکتا تھا۔ وہ پوری تن دہی سے استاد کا کلام جمع کرنے میں لگا ہوا تھا۔

شہر دہلی میں شاعروں کی کمی نہیں تھی لیکن وہ تو پہلے ہی ارادہ کرچکا تھا کہ استاد نہ رہے تو وہ حکیم آغا جان عیش کو استاد بنائے گا۔

ایک دن وہ کالج سے نکلا تو سیدھا آغا جان عیش کے گھر پہنچ گیا۔ سر پر ایک اُنگل بال سفید۔ ایسی ہی داڑھی، سرخ و سپید رنگ۔ گلے میں ململ کا کرتہ جیسے چنبیلی کا ڈھیر پڑا ہنس رہا ہو۔ دیکھتے ہی پہچان گئے۔

"کہو میاں، کیسے آئے؟"

"آج استاد کی یاد بہت ستا رہی تھی، ایک مرتبہ ان کے ساتھ حاضر ہوا تھا۔ آج اکیلا ہی چلا آیا۔"

"ہائے برخوردار! کیا یاد دلا دیا۔ مرحوم کیا گئے کتنوں کے دل اُجڑ گئے۔ اب تو قلعے میں بھی وہ رونق نہ رہی۔ مہتابی کا مشاعرہ اب بھی ہوتا ہے لیکن ان کے بغیر چاندنی، دھوپ کی طرح کھٹکتی ہے۔"

بہت دیر تک استاد ذوق کی باتیں ہوتی رہیں۔ آخر آزاد نے حرفِ مطلب ادا کیا۔

"استاد کے بعد آپ ہی میرے بزرگ ہیں۔ جو کچھ ان سے سیکھتا تھا، آپ سے سیکھنے آتا رہوں گا۔"

"میاں، ان سے ہمارا کیا مقابلہ۔ بزرگوں سے کچھ محاورے سیکھ لیے ہیں، انہی کو شعروں میں جوڑتے پروتے رہتے ہیں۔ بہرحال، دروازے کھلے ہیں جم جم آیئے۔"

"آپ کے یہ محاورے ہی تو استاد کی یاد دلاتے ہیں۔ اب رنگ جہاں کچھ اور ہے۔ کچھ دن گزریں گے کہ یہ بہار بھی لٹ لٹا جائے گی۔"

"نوجوانوں میں ان چیزوں کی قدردانی کہاں۔ تمہیں ہے، غنیمت ہے۔"

اتنی ہمت افزائی بہت تھی۔ وہ پابندی سے وہاں جانے لگا۔ کالج کے طلبہ میں اس کی یہ انفرادیت حیرت سے دیکھی جاتی تھی کہ پہلے ذوق جیسا عظیم شاعر اس پر مہربان تھا اور اب اس کی نشستیں حکیم آغا جان عیش کے ساتھ ہوتی ہیں۔

کالج کی تعلیم مکمل ہو چکی تھی۔ اسے ملازمت کے لیے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ گھر کا پریس اور اخبار تھا۔ تعلیم سے فراغت پاتے ہی پریس کی دیکھ بھال اور اخبار کی اشاعت کا انتظام سنبھال لیا۔ یہیں سے اس کی ادبی زندگی کا ایک نیا دور بھی شروع ہوا۔ اس کی ادبی طبیعت نے صرف انتظامات تک اسے محدود نہیں رکھا۔ اس کی تخلیقات بھی اس اخبار کے سپرد ہونے لگیں۔ اخبار کی ضروریات کے اعتبار سے غزل کے بجائے نظم گوئی کا شعور بیدار ہوا۔ سیاسی حالات پر مبنی نظمیں شائع ہونے لگیں۔ ان نظموں کو دیکھ کر فنی پختگی کے ساتھ یہ احساس ہوتا تھا کہ شاعر کو فارسی ترکیبیں استعمال کرنے کا بے حد شوق ہے۔

ایک انقلاب یہ پیدا ہوا کہ شاعری کے ساتھ ساتھ وہ نثر نگاری کی طرف متوجہ ہوا۔ اپنے مخصوص اندازِ تحریر میں خبریں بنانے کے ساتھ ساتھ ملکی حالات پر مضامین بھی تحریر کرنے لگا۔ عبارت کی رنگینی، فارسی تراکیب، تشبیہات اور استعاروں کے پھولوں کی بہار صاف بتا رہی تھی کہ ابھی اسلوب میں پختگی تو نہیں آئی لیکن ایک ایسا انشاپرداز سامنے آنے والا ہے جو صاحبِ طرز کہلائے گا۔ اس کا انداز سب سے جدا، سب سے الگ تھا۔

استاد کا دیوان سرہانے رکھا تھا اور اس راہ کی مشکلیں اس کے سامنے کھڑی تھیں۔ ایک ایک غزل کو پڑھنا مٹے ہوئے لفظوں کو سمجھنا۔ ناتمام غزلوں کو مکمل کرنے کے لیے شاگردوں اور دوستوں کی یادداشتوں سے مدد لینا۔ جتنا کام کرلیتا تھا، ذوق کے فرزند کے پاس جمع کرا دیتا تھا۔

مشکلوں کا یہ پہاڑ آہستہ آہستہ کٹ رہا تھا کہ ۱۸۵۷ء کا سال سیاہ آن پہنچا۔

موسم گرما کے باعث اول وقت کچہری ہو رہی تھی۔ صاحب مجسٹریٹ محکمہ عدالت میں سرگرم حکمرانی تھے کہ سات بجے میرٹھ کی بغاوت کی خبر سنائی۔

جب تک افواہوں پر کان دھرے جاتے، کمپنی کی باغی سپاہ دہلی میں داخل ہوگئی۔

خنزیر اور گائے کی چربی کے کارتوسوں کا قضیہ کئی دن سے چل رہا تھا۔ جن دیسی سپاہیوں نے ان کارتوسوں کو استعمال کرنے سے انکار کردیا تھا' ان کا کورٹ مارشل کردیا گیا تھا۔ یہ بغاوت اسی کا شاخسانہ تھا۔ دیسی سپاہ میرٹھ سے دہلی تک پہنچ گئی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے لاہوری دروازہ انگریزوں کے خون سے لال ہوگیا۔ جتنے مکان انگریزوں کے تھے' لوٹ لیے گئے۔

دہلی کالج بھی اسی ہنگامے کی زد میں آگیا۔ انگریز اساتذہ جان بچاکر بھاگے اور میگزین میں پناہ لی لیکن جب کمک کی توقع نہ رہی تو انگریزوں نے میگزین کو آگ لگادی۔ ایسا دھماکا ہوا کہ جیسے قیامت زمین پر اتر آئی۔ پورا شہر دھوئیں سے اٹ گیا۔

دہلی کالج کے پرنسپل مسٹر ٹیلر اسی میگزین میں پناہ لیے ہوئے تھے۔ وہ جان بچاکر بھاگے۔ میگزین سے صحیح سلامت باہر نکل آئے لیکن حواس باختہ حیران تھے کہ کہاں جائیں۔ ہر سمت موت کھڑی تھی۔ انہیں اور تو کچھ سوجھا نہیں' بے اختیار کالج کے احاطے کی طرف دوڑ لگادی۔ کالج ویران پڑا تھا۔ دیواروں کے سوا وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ یہ دیواریں انہیں کتنی دیر پناہ دے سکتی تھیں۔ اچانک انہیں اپنا بوڑھا خانساماں نظر آیا۔ شاید وہ اپنی کوٹھری میں ہو۔ وہ ایک موہوم سی امید کے ساتھ کوٹھری میں گھس گئے۔ حالت ایسی تھی کہ برسوں جس نے صاحب کہہ کر پکارا تھا' انہیں پہچاننے کے لیے اپنی آنکھیں ملنے لگا۔

"دیکھ کیا رہے ہو۔ کیا تم بھی پہچاننے سے انکار کردو گے' میں ٹیلر ہوں۔"

"صاحب! یہ آپ ہیں" بوڑھے خانساماں کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے "میں اور بھلا آپ کو نہ پہچانوں لیکن آپ کی حالت ہی ایسی۔"

"حالت کو چھوڑو۔ اس وقت مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

"میری ایک ایک بوٹی آپ کی ہے صاحب!"

"مجھے کسی طرح مولوی باقر کے گھر پہنچادو۔"

"صاحب' اگر باغیوں نے دیکھ لیا تو آپ کے ساتھ میری جان بھی جائے گی۔"

"ابھی تو تم کہہ رہے تھے' تمہاری ایک ایک بوٹی میری ہے؟"

بوڑھے نے کچھ دیر سوچا اور حامی بھرلی۔ وہ انہیں لے کر کشمیری دروازے کے علاقے کھڑکی ابراہیم علی خاں پہنچ گیا جہاں مولوی باقر کا مکان تھا۔

مولوی باقر کو بھی انہیں دیکھ کر وہی حیرانی ہوئی جس سے بوڑھا خانساماں دوچار ہوچکا تھا۔ برسوں کی دوستی تھی اور یہ امتحان کا وقت تھا۔

"باقر' مجھے چھپالو ورنہ میں اپنی جان سے چلا جاؤں گا۔ زندگی رہی تو تمہاری دوستی کا حق ضرور ادا کروں گا۔"

"دوستی کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ آیئے اندر آیئے۔"

مولوی باقر انہیں گھر میں لے آئے اور سوچنے لگے کہ انہیں کہاں چھپایا جائے۔ گھر کے قریب ہی انہوں نے ایک امام باڑہ بنوایا تھا' اس وقت یہی کام آیا۔ انہوں نے ٹیلر کو اس امام باڑے کے تہ خانے میں چھپادیا۔ اس راز سے آزاد کے سوا گھر میں کوئی بھی واقف نہیں تھا۔

اس روز تو انہوں نے یہ خطرہ مول لے لیا لیکن دوسرے دن جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ ان گھروں کو بھی جلا رہے ہیں جہاں کسی انگریز نے پناہ لے رکھی ہے تو انہیں فکر ہوئی۔ انہوں نے بہت رازداری سے کام لیا تھا لیکن محلے میں یہ خبر عام ہوگئی تھی کہ انہوں نے کسی انگریز کو پناہ دی ہے اس لیے بھی انہیں خطرہ اپنے دروازے پر کھڑا نظر آیا۔

"یہ خبر عام ہوگئی ہے کہ آپ یہاں چھپے ہوئے ہیں" مولوی باقر نے مسٹر ٹیلر سے کہا "اب آپ یہاں محفوظ نہیں رہے۔ میں آپ کے لیے کپڑے لایا ہوں۔ ان ہندوستانی کپڑوں میں آپ کو کوئی نہیں پہچانے گا' آپ انہیں پہنیں اور کسی نہ کسی طرح دہلی سے باہر نکل جائیں۔"

چند اہم تصانیف (ادبی)

آبِ حیات' نیرنگِ خیال' سخن دانِ فارس۔ نگارستان فارس۔ دربارِ اکبری۔ دیوانِ ذوق۔ ڈراما اکبر' نظم آزاد۔ خم کدہ آزاد۔

تعلیمی تصانیف

نصیحت کا کرن پھول' قصصِ ہند' فارسی کی پہلی کتاب' دوسری کتاب۔ اردو کی پہلی' دوسری' تیسری اور چوتھی کتاب۔ قواعد اردو۔ قواعد فارسی' جامع القواعد۔ تذکرہ علماء۔ کائناتِ عرب' حکایاتِ آزاد۔ قند پارسی' آموزگار پارسی' لغتِ آزاد۔

عالم جنوں کی تصانیف

مکاشفات آزاد۔ سپارک ونماک۔ فلسفۂ الہیات۔ جانورستان۔

ٹیلر نے بھی سوچا کہ یہاں کب تک چھپے رہیں گے۔ یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ انہوں نے وہ کپڑے پہن لیے۔

"دہلی کالج سے متعلق میرے پاس کچھ کاغذات ہیں" ٹیلر نے کہا "جب دہلی پر انگریزی فوج کا قبضہ ہوجائے تو یہ کاغذات افسر اعلیٰ تک پہنچادینا۔"

مولوی باقر نے وہ کاغذات لے لیے اور انہیں رخصت کردیا۔

مسٹر ٹیلر ابراہیم خاں کی کھڑکی تک پہنچے ہوں گے کہ پہچان لیے گئے۔ اب بچاؤ کی کوئی صورت نہیں تھی۔ کچھ ہی دیر میں خبر آگئی کہ ٹیلر قتل کردیے گئے۔

باغیوں نے بہادر شاہ کے نام پر شہر کا نظم ونسق سنبھال لیا تھا۔

فساد پھیلا تو کچھ سلامت نہ بچا۔ دکانیں لٹ گئیں، مکانات اجڑ گئے۔ جب تک بخت خاں بریلی سے آنہیں گیا، یہی حالت رہی۔

بالآخر بادشاہ نے شہر کا گشت کیا اور حالات پر قابو پالیا۔

دہلی اخبار اب اور بھی آب وتاب سے نکل رہا تھا۔ پل پل کی خبریں چھپ رہی تھیں۔ ایسے مضامین شائع ہورہے تھے جس میں مسلمانوں کو بادشاہ کی مدد کرنے کی تاکید کی گئی تھی۔ مولوی باقر کا ایک فتویٰ بھی چھپا جس میں انہوں نے کہا تھا، یہ جنگ جہاد کی حیثیت رکھتی ہے۔

ان خدمات کی وجہ سے انہیں بادشاہ کا قرب حاصل ہوگیا۔ بادشاہ ہی کے کہنے سے انہوں نے اپنے اخبار کا نام "اخبار الظفر" رکھ دیا۔

وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ انگریزوں کا تسلط ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا لیکن ان کا یہ اندازہ غلط نکلا۔ کئی مہینے کی لڑائی کے بعد انگریزوں نے، سکھ لشکر کی معیت میں دوبارہ دہلی پر قبضہ کرلیا۔

کالوں کے بعد گوروں کی انتقامی کارروائی شروع ہوگئی۔ جو راہ میں ملا، قتل کردیا گیا۔ وہ باپردہ مستورات جنہوں نے گھر کی دہلیز بھی کبھی نہیں دیکھی تھی، ننگے پاؤں، برہنہ سر، سڑکوں پر بھاگی جارہی تھیں۔ جو رہ گئے تھے، وہ موت کے استقبال میں آنکھیں کھولے جاگ رہے تھے۔

ذوق کا فرزند محمد اسمٰعیل اپنی بیوی کو لے کر گھر سے نکلا اور ایسا غائب ہوا کہ پھر کسی کو نہیں ملا۔ ملتا کہاں سے، کسی گولی کا نشانہ بن گیا اور سیکڑوں لاشوں کے ساتھ دفن ہوگیا۔

آزاد کو جتنا دکھ اس کے مرنے کا ہوا، دلی لٹنے کا بھی نہیں تھا۔ استاد کی یہ نشانی بھی رخصت ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی آزاد کی برسوں کی محنت بھی قتل ہوگئی۔ اس نے استاد کی جو غزلیں صاف کرکے اسمٰعیل کے پاس جمع کرادی تھیں، وہ اس کے ساتھ ہی دفن ہوگئیں۔

○☆○

باغیوں کا زور ٹوٹتے ہی انگریزوں کا تسلط پوری طرح قائم ہوگیا۔ قتل کرنے کو کچھ نہ بچا تو گرفتاریاں شروع ہوگئیں۔

ہنگامہ فرو ہوتے ہی مولوی باقر کو ان کاغذات کا خیال آیا جو مسٹر ٹیلر انہیں دے گئے تھے۔ وہ اس خیال سے ہڈسن صاحب کے پاس پہنچ گئے کہ ان کاغذات کو ان کے حوالے کرکے وہ انگریز دوستی کا ثبوت دیں گے اور آئندہ کے لیے راہیں ہموار ہوجائیں گی۔

ہڈسن نے ان کاغذات کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور ایک گہری سانس لی۔

"ویل! مسٹر ٹیلر کہاں ہیں؟"

"وہ تو قتل کردیے گئے۔ باغیوں نے انہیں مار دیا۔"

مولوی صاحب نے پوری روئیداد سنادی۔

"آپ کو ان کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا جاتا ہے۔"

مولوی باقر اپنی صفائی پیش کرتے رہ گئے لیکن کون سننے والا تھا۔

بعد میں یہ سننے میں آیا کہ مسٹر ٹیلر نے ان کاغذات پر یہ عبارت لکھ دی تھی کہ یہ شخص مجھے بچاسکتا تھا لیکن اس نے کوئی کوشش نہیں کی۔ اسی عبارت کو پڑھ کر ہڈسن نے ان کی گرفتاری کے احکامات صادر کیے۔

دوسرے بہت سے مکانوں کی طرح محمد حسین کا مکان بھی جاگ رہا تھا۔ بچے خوف سے سہمے ہوئے تھے، بڑے فکر سے۔

دروازے کے دل پر کسی نے زور سے لات ماری پھر جیسے گھونسے برسنے لگے۔ فتح یاب لشکر کے بہادر گھر میں گھس آئے اور بندوقیں تان لیں۔

"تمہارا باپ باغیوں کا دوست تھا۔"

"یہ غلط ہے مگر پھر بھی تم نے اسے گرفتار تو کرلیا، اب کیا ہے؟"

"فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔"

"گھر سے نکل جائیں، اپنے گھر سے؟"

"گھر ہی سے نہیں، شہر سے نکل جاؤ۔ جلدی کرو۔"

بھرا گھر سامنے پڑا تھا۔ کون سی چیز اٹھائے، کون سی رہنے دے۔ قیمتی زیور تو پہلے ہی کنوئیں کی تہ میں اتار دیا تھا۔ اسے نکالنے کا وقت نہیں تھا۔ بھاری چیزیں سمیٹی نہیں

جاسکتی تھیں۔ اس کی نظر ذوق کی غزلوں کے مسودے پر پڑی' محمد حسین! اگر خدا نے کرم کیا اور زندگی باقی ہے تو سب کچھ ہوجائے گا مگر استاد کہاں سے پیدا ہوں گے جو یہ غزلیں پھر آکر کہیں گے۔ اس نے مسودہ ہاتھ میں اٹھایا۔ سجے سجائے گھر کو چھوڑ کر ایکسیں نیم جانوں کے ساتھ گھر سے نکل گیا۔ ان میں آزاد کی اہلیہ اور برس بھر کی لڑکی بھی تھی۔ وہ پھوپی بھی تھیں جو آزاد کی ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھتی تھیں۔

"محمد حسین' ہم جائیں گے کہاں؟" آزاد کی پھوپی نے پوچھا۔

"ابھی کچھ نہ سوچئے۔ گھر سے نکلئے ورنہ ان فرنگیوں کا کچھ بھروسا نہیں۔"

ان کا کنبہ بھاگم بھاگ' کھلا گھر چھوڑ کر گھر سے نکلا۔ گھر سے دور جاکر دھوبی واڑے کی گلی میں پہنچ کر آزاد نے سب کو رکنے کا اشارہ کیا۔

"یہاں سکون سے بیٹھ کر سوچتے ہیں کہ شہر سے باہر کس طرح نکلیں اور کہاں جائیں؟"

"یہاں؟ اس گلی میں بیٹھیں؟" آزاد کی پھوپی نے کہا۔

"پھوپی اماں' یہ تو وہ وقت ہے کہ بادشاہِ دہلی بھی ننگی چارپائی پر بیٹھا ہوا ہوگا۔ ہم بھلا کیا چیز ہیں۔"

گلی سنسان پڑی تھی۔ ہر دروازے پر خوف کے تالے پڑے ہوئے تھے۔ کھلے بھی ہوتے تو کیا ہوتا۔ جنہیں انگریزوں نے شہر سے نکل جانے کا حکم دیا تھا' انہیں پناہ کون دیتا۔ یہ سب ایک دیوار کا سہارا لے کر زمین پر بیٹھ گئے۔ جلدی جلدی طے ہوا کہ سونی پت جایا جائے۔

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ گلی میں ایک گولہ آکر گرا۔ دھماکا اتنا شدید تھا کہ آزاد کی شیر خوار بیٹی جو ماں کی گود میں تھی' اس صدمے سے بے ہوش ہوگئی۔ یہ نئی افتاد تھی لیکن اس وقت ہر افتاد جانوں کی قیمت سے کم تھی۔ ماں نے بے ہوش بچی کو سینے سے لگایا کہ راستے میں ہوش آجائے گا۔

یہ قافلہ دھوبی واڑہ سے نکلا اور تین میل برابر پیدل چلتا ہوا برف خانے پہنچا۔ اب جان میں جان آئی کہ شہر سے باہر نکل آئے تھے۔ بے فکری تو ہوگئی تھی لیکن پیٹ بڑا روزخ ہے۔ اسے تو ہر حال میں کھانے کو چاہیے ہے۔ ایک کھیل بھی اڑ کر منہ تک نہیں پہنچی تھی۔ سواریوں کا بندوبست نہیں تھا۔ کب سونی پت کی شکل دیکھنے کو ملتی ہے' کیا خبر۔ کچھ پیٹ میں ڈال لیا جائے۔ ایک درخت نظر آیا' اسی کے نیچے سب بیٹھ گئے۔ تھکن اور بھوک سے برا حال تھا۔ جس کے پاس جو کچھ تھا' نکال کر سامنے رکھ دیا کہ کھانے کا بندوبست کرو۔

متفرقات آزاد۔

بیاضِ آزاد' سیرِ ایران' مکتوباتِ آزاد۔

غیر مطبوعہ تصانیف

تاریخی مقامات۔ ترکی قواعد۔ عربی قواعد۔ قواعد اردو۔ قواعد فارسی۔

اس کے علاوہ کم وبیش ۸۹ مسودات جو انہوں نے عالمِ جنوں میں تحریر کیے۔

سیاحت

وسط ایشیا' ایران۔

منشی بشیر حسین بھی ساتھ تھے جو آزاد کے چھاپے خانے کے منتظم تھے۔ انہوں نے پیسے جیب میں ڈالے اور کھانے کا انتظام کرنے کے لیے روانہ ہوگئے۔

ہزار دقتوں کے بعد سونے کے مول آٹا ملا اور وہ بھی گھنٹوں کی تگ ودو کے بعد۔ اس کھلے میدان میں چولھا کہاں۔ مٹی کے ٹھیکرے میں آٹا گوندھا۔ پتھر جمع کرکے ان کا چولھا بنایا۔ ادھر ادھر سے درختوں کے پتے اور سوکھی ٹہنیاں جمع کیں اور آگ جلائی۔ ٹھیکرے ہی سے توے کا کام لیا اور کچی پکی روٹیاں پک گئیں۔ پتھروں پر ہی لہسن مرچ کی چٹنی پیسی۔

اب یہ فکر تھی کہ بیل گاڑیاں مل جائیں تو سونی پت کا سفر طے ہو۔ یہ وقت تمام' بیل گاڑیاں کرائے پر کی گئیں۔

"منشی صاحب' آپ ان بیل گاڑیوں کے ساتھ سونی پت جائیں۔ زندگی رہی تو میں آپ سے بعد میں آکر مل لوں گا" آزاد نے کہا۔

"مگر آپ کہاں جارہے ہیں؟"

"میں واپس دہلی جارہا ہوں۔"

"اے ہے! دہلی" آزاد کی بیوی کی چیخ بلند ہوئی۔

"ہاں دہلی۔ میں بابا جانی سے آخری بار ضرور ملوں گا۔"

"اب ایک کو رو رہے ہیں پھر ہم دو کو روئیں گے اور اس بچی کی طرف تو دیکھو' اسے ہوش آگیا ہے لیکن نہ ہنستی ہے نہ روتی ہے۔ کیا خبر کیا ہوجائے۔ آپ ہمارے ساتھ ہی چلیں" اس کی اہلیہ نے کہا۔

منشی صاحب نے بھی سمجھایا لیکن اس نے کسی کی ایک نہ سنی۔

"اللہ نگہبان ہے۔ میں ایک مرتبہ اپنے والد سے ضرور ملوں گا۔"

آخر یہ قافلہ روتا پیٹتا روانہ ہوگیا۔ آزاد نے استاد کا کلام بغل میں دبایا اور دہلی کی طرف روانہ ہوگیا۔

دہلی پہنچ کر اسے خیال آیا کہ اس مقتل میں اس کی مدد کون کرے گا۔ یہاں اب رہا کون ہوگا جس کے دروازے پر دستک دے۔ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔ اس اندھیرے میں کون روشنی دکھائے گا۔ آخر اسے اپنے باپ کے دوست سکھ جرنیل کا خیال آیا۔ وہ گرتا لڑکھڑاتا ان کے پاس پہنچ گیا۔

"کیا کروگے ان سے مل کر۔ اور پھر یہ ممکن بھی نہیں ہے۔ تم میرے پاس رہو' میں تمہاری پوری حفاظت کروں گا۔"

"میں صرف ایک نظر انہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔ کوئی بات نہیں کروں گا' خاموش رہوں گا۔ بس آپ کسی طرح مجھے ان کے سامنے پہنچادیں۔"

وہ سکھ برابر انہیں سمجھاتا رہا بالآخر تیار ہوگیا لیکن اس شرط پر۔

"تمہیں یہ لباس بدل کر میرے سائیس کا لباس پہننا ہوگا اور میرے گھوڑے کے ساتھ ساتھ اس طرح دوڑنا ہوگا جیسے تم کوئی اور نہیں' میرے گھوڑے کے رکھوالے ہو' میرے نوکر ہو۔"

"مجھے ہر شرط منظور ہے۔"

"اب سوجاؤ۔ رات بہت ہوگئی ہے۔ میں صبح وہاں لے چلوں گا۔"

صبح ہوئی تو آزاد نے اپنا حلیہ بدلا۔ سائیس کا لباس پہنا اور سکھ جرنیل اپنے گھوڑے پر سوار ہوا۔ یہ وہی دہلی تھی جہاں وہ استاد ذوق کے ساتھ چہل قدمی کے لیے نکلا کرتا تھا اور اب ایک سکھ جرنیل کے گھوڑے کے ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا۔

دہلی دروازے کے باہر باغی قیدی لق ودق میدان میں پڑے تھے۔ چاروں طرف سنگین بردار پہرے پر تھے کہ کوئی جان بچاکر نکل نہ بھاگے۔

کوئی قیدی بھوک سے رو رہا تھا۔ کسی کو موت اور بربادی کا غم تھا۔ بہت سے بے فکرے اس عالم میں بھی بے فکر تھے۔

سکھ جرنیل ایک ایک قیدی کے پاس جاکر اس کا معائنہ کررہا تھا۔ مطلب یہی تھا کہ مولوی باقر کہیں نظر آجائیں۔

ایک جگہ آزاد کے قدم رک گئے۔ شفیق باپ' بے زبان بنا بیٹھا تھا۔ نظر اٹھاکر دیکھا تو نازوں کا پالا' اکلوتا جگر گوشہ محمد حسین آزاد' سائیس کے لباس میں کھڑا ہے۔ کچھ کہنے کے لیے لبوں کو جنبش ہوئی تھی کہ آزاد نے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ہونٹ خاموش ہوئے تو آنکھیں باتیں کرنے لگیں۔ ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

زیادہ دیر کسی قیدی کے پاس کھڑے رہنا مناسب نہیں تھا۔ جرنیل نے گھوڑے کو آگے بڑھایا۔ سائیس کو بھی آگے چلنا پڑا لیکن اس طرح کہ پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتا جاتا تھا۔ قیدی کے دونوں ہاتھ دعا کے لیے بلند تھے' اے خدا! میرے بیٹے کو سلامت رکھ۔'

شہر میں افواہ پھیلی کہ تمام قیدیوں کو گولی کا نشانہ بنادیا گیا ہے۔ اب آزاد کی باری تھی۔ اس کے ہاتھ دعا کے لیے بلند تھے' اے خدا! میرے والد کی قربانی قبول کر۔ اس کے آنسو دل ہی دل میں کہیں اتر کر رہ گئے۔

اب کسی ملاقات کی توقع نہیں تھی۔ دلی نے اسے سب کچھ دیا تھا اور سب کچھ چھین لیا۔ اب وہ یہاں رہ کر کیا کرتا' اس نے اجازت طلب کی۔

استاد کے کلام کا پلندا اس کی بغل میں تھا۔ آٹا گوندھنے کا تسلا اور ایک دری بھی ساتھ تھی۔ وہ شہر سے باہر نکلنا چاہتا تھا کہ ایک فرنگی نے اسے ٹوکا۔

"اے بڈھا! اس میں کیا ہے؟" اس انگریز نے بندوق کی سنگین سے کاغذوں کا پلندا زمین پر گرادیا۔ کاغذ اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ جب اس نے دیکھا کہ کاغذوں کے سوا کچھ نہیں تو کچھ بکتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ آزاد پاگلوں کی طرح اڑتے ہوئے کاغذوں کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ بہ دقت تمام کاغذوں کو جمع کیا اور آگے بڑھ گیا۔

اس کی عمر صرف ستائیس سال تھی لیکن پریشانیوں نے اس کی حالت ایسی کردی تھی کہ اس انگریز نے اسے بڈھا کہہ کر مخاطب کیا۔

کیا میں بوڑھا ہوگیا ہوں؟ اس نے چلتے چلتے سوچا۔ اس انگریز نے ٹھیک ہی تو کہا۔ جو مرتے نہیں ہیں وہ بوڑھے ہی تو ہوجاتے ہیں۔ میری بنائی ہوئی جنت مسمار ہوگئی۔ عزیز و اقارب چھوٹ گئے۔ باپ کا سایہ اٹھ گیا۔ روزگار' کاروبار' لکھنا پڑھنا سب کچھ ختم ہوگیا۔ اب میں بے یار و مددگار ہوں۔ بے سہارا ہوں اور بے وطن بھی۔ دھوپ آنکھوں میں گھسی چلی آتی تھی اور وہ سامان سر پر لادے کسی مزدور کی طرح اسی دھوپ کا سینہ چیر کر آگے بڑھ رہا تھا۔ جس طرح

ابھی ہندوستان کا مستقبل طے نہیں ہوا تھا' اسی طرح اس کی کوئی منزل نہیں تھی۔ راستے میں ایک بستی نظر آئی۔ ایک ٹوٹی پھوٹی مسجد دیکھی۔ اس کی سیڑھیوں پر جا بیٹھا۔ کسی نے فقیر سمجھ کر کچھ کھانے کے لیے دے دیا۔ اس نے آنکھ اٹھا کر دیکھا۔ دو روٹیوں پر کچھ سالن رکھا تھا۔ بھوکا تھا۔ بے حال تھا۔ وہ یہ بھی نہ بتا سکا کہ وہ کون ہے کہاں سے آیا ہے' کہاں جاتا ہے۔ سر جھکا کر نوالے توڑنے لگا۔

روٹی دینے والے نے آبخورے میں پانی لا کر رکھ دیا۔ حلق میں پھنسے ہوئے نوالوں کو اس نے پانی سے نیچے اتارا۔

"بابا! دعا کرنا" روٹی لانے والے نے کہا اور واپس چلا گیا۔

اس نے دری بچھائی اور کمر سیدھی کرنے کے لیے لیٹ گیا۔ لیٹتے ہی خیالوں نے پاؤں دابنے شروع کر دیے۔ کتنے ہی منظر آنکھوں کے سامنے آئے اور چلے گئے۔ دلی جو ایک شہر تھا مگر اب کہاں ہے۔ مشاعروں کی محفلیں سجتی تھیں' میلے لگتے تھے۔ قلعے کی کیا شان تھی۔ کیسے کیسے باکمال تھے۔ سب کچھ اجڑ کر رہ گیا۔ اب وہ صورتیں دوبارہ دیکھنے کو کیا ملیں گی۔

اس نے رات اسی مسجد میں گزاری۔ صبح ہوتے ہی وہاں سے روانہ ہو گیا۔ ایک گاؤں سے گزر ہوا۔ کسی پیڑ کے نیچے بہت سے بچے اپنا اپنا سبق یاد کر رہے تھے۔ یہ گویا اس گاؤں کا اسکول تھا۔ وہ بھی ایک طرف بیٹھ گیا۔

"بھائی کہاں سے آ رہے ہو۔ کہاں جانا ہے؟" بچوں کے مولوی صاحب نے پوچھا۔

"دلی سے آ رہا ہوں۔ اب آگے تقدیر ہے جہاں پہنچا دے۔"

"دلی میں تو سنا ہے بڑی مار کاٹ ہوئی ہے۔"

"بہت۔"

"کیا فرنگی آ گئے؟"

"ہاں!"

"لکھنؤ تو اب بھی ڈٹا ہوا ہے۔ نوابی ختم ہو گئی مگر مجاہد ڈٹے ہوئے ہیں۔"

لکھنؤ کا نام سنتے ہی جیسے اسے منزل مل گئی۔ لکھنؤ نے ہمیشہ دلی کے باکمالوں کو سر آنکھوں پر بٹھایا ہے۔ میر' سودا' سوز' مصحفی اور انشا جیسے باکمالوں نے لکھنؤ ہی سے فیض اٹھایا تھا۔ ابدالی کی فوجوں نے جب دلی کی اینٹ سے اینٹ بجائی تھی تو میر نے لکھنؤ کا رخ کیا تھا۔ آج مجھ پر بھی وہی وقت پڑا ہے۔ مجھے بھی لکھنؤ جانا چاہیے۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"کہاں چلے مسافر۔"

"مجھے اپنی منزل یاد آ گئی۔"

"واہ! ایسے کیسے' ہمارے گاؤں میں مسافر آئے اور ہم اسے کھائے پیئے بغیر جانے دیں" مولوی صاحب نے کہا اور ساتھ ہی بچوں کو حکم دیا کہ اپنے اپنے گھروں سے جو کچھ ہے فوراً لے کر آئیں۔ بچے تتلیوں کی طرح اڑ گئے۔

تھوڑی دیر میں دسترخوان بھی سج گیا اور گاؤں کے کچھ لوگ بھی آ گئے۔

ہر آدمی کو دلی کی بپتا سننے کی خواہش تھی۔ اسے نہ چاہتے ہوئے بھی بتانا پڑ رہا تھا۔ جو کچھ اس پر گزری تھی' دوسروں کی کہانی بنا کر سنا رہا تھا۔

خود بھی رویا' دوسروں کو بھی رلایا اور اس گاؤں سے روانہ ہو گیا۔

اسی طرح مسجدوں اور سرائیوں میں ٹھہرتا ہوا' کئی مہینوں کی مسافت طے کرنے کے بعد لکھنؤ پہنچ گیا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ اعلانیہ کہتا کہ مولوی محمد باقر کا بیٹا محمد حسین آزاد آیا ہے لیکن اب وہ ہر کس و ناکس پر اپنا حال ظاہر نہیں کر سکتا تھا۔ حال ایسا تھا بھی نہیں کہ کسی پر ظاہر کیا جاتا۔ کسی کو معلوم ہو بھی جاتا تو اتنے سوال کرتا کہ اس کے زخم تازہ ہو جاتے۔ وہ خاموشی سے ایک سرائے میں جا کر ٹھہر گیا۔

حالات یہاں کے بھی حسب دل خواہ نہیں تھے۔ واجد علی شاہ اختر مٹیا برج کلکتہ میں تھے اور اس کی ملکہ سلطنت کو بچانے کے لیے انگریزوں کے سامنے ڈٹی ہوئی تھی۔ دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہوتے ہی' مجاہدین لکھنؤ پہنچنا شروع ہو گئے تھے۔ اب صاف معلوم ہوتا تھا کہ دوسری بڑی جنگ لکھنؤ میں اور اس کے آس پاس لڑی جائے گی۔

جب میر اور سودا یہاں آئے تھے تو حالات دوسرے تھے۔ آصف الدولہ کا چشمۂ فیض جاری تھا۔ آزاد یہاں پہنچا تو سب کنوئیں خشک ہو چکے تھے۔ دربار کی سرپرستی ختم ہو چکی تھی البتہ ادب کے سوتے خشک نہیں ہوئے تھے۔

وہ کچھ دن سرائے میں بند رہنے کے بعد باہر نکلا۔ باہر نکلنا بھی بس اس اتفاق کے طفیل ہو گیا کہ اس کی ملاقات ارسطو جاہ رجب علی کے صاحب زادے سے ہو گئی۔ رجب علی اس کے باپ کے شاگرد تھے۔ اس حوالے سے ان کا بیٹا اس کا قدرداں تھا۔

کوئی لکھنؤ آئے اور میر انیس سے ملے بغیر چلا جائے؟ اسے خود تعجب ہو رہا تھا کہ اب تک اپنی پریشانیوں میں ان سے ملاقات کا خیال کیوں نہیں آیا۔ اس نے اشتیاق ظاہر کیا

اور ارسطو جاہ کا بیٹا اسے لے کر میر انیس کے درِ دولت پر پہنچ گیا۔ جیسا سنا تھا ویسا ہی دیکھا۔ میانہ قد' گورا رنگ خوش اندام۔ سر پر بانکی ٹوپی تہذیب کا انگرکھا پھنسی ہوئی آستینوں کا۔ کمر سے دوپٹا بندھا ہوا۔ اس وقت بالا خانے پر بیٹھے سڑک کی سیر کر رہے تھے' اوپر ہی بلوالیا۔

انیس نے یہ اہتمام پہلے ہی کرلیا تھا کہ ان کا حال ظاہر نہ ہونے پائے۔ بس انہیں دیکھنا اور ان کے لبوں سے نکلے ہوئے پھولوں کو سمیٹنا مقصود ہے۔

انیس کو صرف یہ معلوم ہوسکا کہ یہ صاحب دہلی سے تشریف لائے ہیں۔ گردشِ دوراں کے ستائے ہوئے ہیں اس لیے لائقِ تکریم ہیں۔

شہرت اور الا پچیوں سے تواضع ہوئی اور ساتھ ہی ساتھ دہلی کی بربادی کی باتیں ہوتی رہیں۔ غالب کا ذکر آیا' داغ کے متعلق پوچھا۔ بڑی دیر تک کفِ افسوس ملتے رہے۔

"میاں' دلی والوں کا کچھ کلام تو سناؤ" انیس نے کہا۔

آزاد نے بے اختیار ذوق کا یہ مطلع پڑھ دیا۔

کوئی آوارہ تیرے نیچے اے گردوں نہ ٹھہرے گا
ولیکن تو بھی گر چاہے کہ میں ٹھہروں نہ ٹھہرے گا

یہ مطلع وقت اور حالات سے ایسی مناسبت رکھتا تھا کہ انیس پھڑک ہی تو اٹھے۔

"میاں' یہ شعر ہے کس کا؟"

"شیخ ابراہیم ذوق کا۔"

انیس نے سنا اور چپ ہوگئے لیکن صاف ظاہر ہوتا تھا کہ شعر ہی میں الجھے ہوئے ہیں۔ دو چار باتیں کرکے پھر فرمایا' ذرا وہی شعر پھر تو پڑھیئے گا۔ آزاد نے پھر پڑھا۔ اب انیس نے اسے اپنی زبان سے پڑھا۔

"صاحب کمال کا یہی تو فن ہے کہ جو لفظ جس مقام پر اس نے بٹھادیا ہے اسی طرح پڑھا جاوے تو ٹھیک ہے ورنہ شعر اپنے رتبے سے گر جاتا ہے۔"

"استاد ذوق کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟" آزاد نے پوچھا۔

"میاں! میر کے بعد دلی میں ایسا شاعر کون ہوا ہے۔"

اس انوکھے خراجِ عقیدت کے بعد آزاد نے اجازت چاہی۔ بڑی دیر تک اس جملے کا سرور طاری رہا۔ اس کے استاد کی تعریف ایک دوسرے باکمال نے ایسے الفاظ میں کی تھی۔

○☆○

بھٹیارن نے چراغ میں تیل ڈال کر سرہانے رکھ دیا تھا۔ جب ذرا اندھیرا ہوا' اس نے چراغ روشن کیا۔ انیس کی ملاقات ابھی تک حواس پر چھائی ہوئی تھی۔ اس نے ایک نظر استاد کے غیر مطبوعہ دیوان پر ڈالی۔ یہ غزلیں اگر شائع ہوجائیں تو انیس جیسے دوسرے باکمال بھی ان سے واقف ہوں۔ دیکھیں کہ لفظوں کے کیسے گل کھلائے ہیں۔ محاوروں کے کیسے گل دستے باندھے ہیں۔ مضامین عرش سے زمین پر اتارے ہیں لیکن آہ! گردشِ زمانہ کہیں بیٹھنے بھی دے کہ اسے از سرِ نو مرتب کروں۔ وہ دماغ' وہ فرصت' وہ فارغ البالی کہاں سے لاؤں۔ کب تک ان کاغذوں کی حفاظت کرتا رہوں گا۔ اس خیال کے ساتھ ہی ایک اور خیال نے اس کے دل پر دستک دی۔ ذوق کے علاوہ بھی تو کتنے ہی باکمال ہیں جنہیں کل دنیا فراموش کردے گی۔ بزرگانِ سلف کی جو عظمت ہمارے دلوں میں ہے' آنے والوں کے دلوں میں کب ہوگی۔ ان کا کلام باقی رہ بھی گیا تو ان کے حالات سے لوگ کیسے واقف ہوں گے۔ کوئی ایسی کتاب ہو جس سے ان بزرگوں کی تصویر آنکھوں کے سامنے گھوم جائے' کتنے ہی بزرگوں کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے' کتنوں کے حالات معلوم کیے جاسکتے ہیں۔ اس کتاب کا نام میں "آبِ حیات" رکھوں گا۔

لکھنؤ میں دو عظیم یادگاریں اس وقت بھی موجود تھیں۔ میر تقی میر اور مرزا سودا کے صاحب زادگان یہ دونوں سے ملے۔ ان کے حالات اور اشعار جمع کیے۔

اس پریشان حالی میں بھی وہ ادبی تحقیق میں مصروف تھا کہ اسے یہ اطلاع ملی کہ اس کی گرفتاری کے وارنٹ نکل چکے ہیں اور گرفتار کرنے والے کے لیے پانچ سو کا انعام مقرر ہوا ہے۔ شاید یہ تحقیق ہوگئی تھی کہ دہلی اردو اخبار میں شائع ہونے والے باغیانہ مضامین اور اشتہار اس کے قلم سے نکلے تھے۔

اس اطلاع کے بعد اس کا گھبرا جانا لازمی تھا۔ انعام کے لالچ میں کوئی شخص بھی مخبری کرسکتا تھا۔ اس نے اپنا حال چھپایا ضرور تھا لیکن بہت سے لوگوں کو معلوم بھی تھا۔

اس نے اپنا مختصر سا سامان اٹھایا اور کسی کو کچھ بتائے بغیر لکھنؤ سے روانہ ہوگیا۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں گیا۔ خود اسے بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں جائے گا۔ پھر وہی دہشت وہی خارِ مغیلاں تھے۔ آسماں دور زمیں سخت تھی۔ اب پورے ملک میں شورش کے حالات پیدا ہوگئے تھے۔ کہیں جائے اماں نہیں تھی۔ اس نے کئی راتیں غیر آباد بیابانوں میں گزار دیں۔ آخر چلتے چلتے مدراس پہنچ گیا۔

نیل گری کے ملٹری اسکول میں استاد کی جگہ خالی تھی۔ اس کے ذوقِ علمی نے اسے اسکول کے سامنے لے جاکر کھڑا کردیا تھا کہ ایک آدمی اسے ضرورت مند سمجھ کر اندر لے گیا۔

"کچھ پڑھے لکھے بھی ہو؟"

"ہاں۔ میں نے دہلی کالج سے مشرقی شعبے کی تعلیم مکمل کی ہے۔"

"تم تو بہت پڑھے لکھے ہو" اس آدمی نے کہا "نوکری کروگے؟"

"کروں گا۔"

اسے اس اسکول میں نوکری مل گئی۔ اس نے اس سارے کو غنیمت سمجھا اور بچوں کو پڑھانے لگا۔

اس نے بس اتنے دن وہاں نوکری کی کہ کچھ پیسے جمع کرلے۔ پیسے جمع ہوتے ہی وہ وہاں سے بھی نکل گیا اور بمبئی آگیا۔ بمبئی میں پارسیوں کی کثرت تھی اور آزاد کو قدیم فارسی سے عشق تھا۔ وہ پارسیوں کے موبدوں سے ملا۔ ان کے صحیفے دیکھے اور ان کی زبان کا جائزہ لیا۔

اس نے یہ سفر کسی علمی تحقیق کے لیے نہیں کیا تھا۔ اس غریب الوطنی میں اتنی فرصت اسے تھی بھی نہیں۔ وہ تو یہاں اس لیے آیا تھا کہ کسی طرح یہاں اس کے قدم جم جائیں لیکن وہی مثل صادق آئی کہ آگ لینے گئے تھے پیغمبری مل گئی۔ اکتسابِ علم کا موقع ملا تو اس نے اسے جانے نہیں دیا۔

آخر وہ یہاں بھی زیادہ عرصے نہ رہ سکا۔ اس نے پنجاب کا رخ کیا۔ شہر شہر کی سیر کرتے، مالوے سے گزرتے ہوئے اس نے پنجاب کی ریاست جند میں قدم رکھا۔ یہ مشہور سکھ ریاست تھی۔ راجا سروپ سنگھ یہاں کا راجا تھا۔ اس راجا نے انگریزوں کی بیش بہا خدمات انجام دی تھیں اس لیے اسے حکومت کی نظروں میں وقعت حاصل تھی۔

۱۸۵۷ء کے بعد دیسی ریاستیں باکمالوں کا بڑا مرکز تھیں۔ دلی اور لکھنؤ کے باکمال رامپور، بھرت پور، پٹیالہ اور حیدر آباد کا رخ کررہے تھے۔ آزاد نے ان ریاستوں کو چھوڑ کر ایک دور دراز کی ریاست کا انتخاب شاید اس لیے کیا ہو کہ راجا سروپ سے تعلقات بڑھاکر اپنا قصور معاف کرالیں۔

کچھ دن کی بے کاری کے بعد اسے دفتر فوجداری میں محافظ دفتر کی نوکری مل گئی۔

یہ نوکری اس کا گوہرِ مقصود نہیں تھا۔ وہ برابر اس کوشش میں لگا ہوا تھا کہ کسی طرح دربار تک اس کی رسائی ہوجائے۔ ریاستوں میں جتنے داؤ پیچ ہوتے ہیں، اس نے سب استعمال کیے اور بالآخر اسے راجا کی قربت نصیب ہوگئی۔

مغلیہ حکومت ختم ہوگئی تھی لیکن ان ریاستوں میں قصائد کی گرم بازاری تھی۔ وہی شاعر سرسبز ہوسکتا تھا جو پُرعظمت قصیدے لکھ سکتا ہو۔ آزاد نے ذوق کے دامنِ تربیت سے فیض اٹھایا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ قصیدے کی تشبیب اور گریز شاعر کی قادرالکلامی اور جدت طرازی کا اصل میدان ہوتی ہے۔ آزاد کی وہ علمیت جس نے اس کی غزلوں کو رسمی اور بے کیف بنادیا تھا، قصائد میں بڑے پُرشوکت انداز سے عیاں ہوئی۔

فروغِ نور سے کس کی ہے یہ جہاں روشن
کہ ہے زمیں سے دلاتا بہ آسماں روشن
زسکہ عام انوار مہر زرہ نواز
جہاں جہاں ہیں منور مکاں مکاں روشن
یہی نظر ہے کرم کی تو چرخ پر ہوں گے
بہ مشکل ماہِ ثریا و فرقداں روشن
طلوعِ نیر اعظم کا دیکھنا جلوہ
ہوئی ستارہ نمط چشم مرداں روشن
چراغِ گل کے یہ انوار ہیں چمن میں کہ ہے
برنگ کشتِ فلک باغ کن فکاں روشن
پئے شعاع ہے لازم سرایت انوار
کہ ہوں زمیں میں جگرہائے بحروکاں روشن

مگر ہمیشہ سے تھی طبع خود بخود مائل
بہ اکتساب علوم و بہ ابتنائے فنون
بہ صرف نحو و معانی گہنے بہ علمِ ادب
گئے بہ علم لغت ہوتا شوقِ دل تھا فزوں
کبھی صحاح تھی پیشِ نظر کبھی قاموس
محاورات عرب پرزبس تھا دل مفتوں
گئے بہ علم حدیث وگئے بہ علم اصول
گئے بہ فقہ وفرائض تھی طبع راہِ نموں

اس نے ایک نہیں، کئی قصیدے دربار میں گزارے۔ وہ ذوق کا شاگرد ہونے کا حق ادا کررہا تھا لیکن جوہر تو اس وقت کھلتے ہیں جب محنت کا صلہ اور کاوش کی داد خاطر خواہ ملے۔ یہ دربار ضرور تھا لیکن دلی یا لکھنؤ کا دربار نہیں تھا۔ انہیں یہ دربار اپنی اڑان کے بہت کم نظر آنے لگا۔

وہ یہاں سے نکلنے کی فکر میں تھا لیکن اس آشیانہ امن سے اڑتا تو کہاں جاکر بیٹھتا۔ بس اسی فکر میں اسے دس مہینے گزر گئے۔

ارسطو جاہ رجب علی شاہ اس کے والد کے شاگرد رہ چکے تھے۔ ان کے لڑکوں سے وہ لکھنؤ میں مل چکا تھا۔ اب اسے معلوم ہوا کہ انہوں نے لدھیانہ کے قریب جگراؤں میں ایک پریس مجمع البحرین کے نام سے قائم کیا ہے۔ آزاد خوش نویس بھی تھا اور پریس کے کام سے واقفیت بھی تھی لہٰذا اس نے رجب علی شاہ کو خط لکھا کہ اگر وہ اسے اپنے پریس میں کام دیں تو وہ بھی ریاست جند سے جگراؤں آسکتا ہے۔

رجب علی کی طرف سے مثبت جواب ملا تھا۔ اب ریاست سے نکلنے کا سوال تھا۔ راجا کی مرضی کے بغیر وہ یہاں سے قدم نہیں نکال سکتا تھا۔ ملازمت کا کنتا تو راجا کی سبکی ہوتی۔ وہ اسے اپنی توہین بھی سمجھ سکتا تھا۔ اس لیے آزاد نے اپنی گھریلو مصروفیات کو بہانہ بناکر استعفیٰ پیش کردیا۔ اس کے باوجود راجا اسے روکنے پر بضد تھا۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح اس نے راجا سے اجازت لے ہی لی۔

وہ جند سے نکلا اور جگراؤں (لدھیانہ) پہنچ گیا۔ ملاقات کا عجب منظر تھا۔ وہ عمر میں بہت چھوٹا تھا لیکن پے در پے صدمات اور انقلابات سے بوڑھا ہوگیا تھا۔ ارسطو جاہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کے سامنے کا بچہ اس حال میں ان کے سامنے آئے گا۔ استاد کو یاد کرکے خوب روئے۔

"آپ کے والد اور دادا میرے استاد رہے ہیں۔ آج میں جو کچھ ہوں، انہی کا فیض ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ میرا جو کچھ ہے، آپ کا ہے۔ اب آپ کو کوئی فکر نہیں ہونی چاہیے۔ اب آپ اپنے گھر والوں کو بھی یہیں بلالیں۔"

ان کا یہ سلوک دیکھ کر آزاد کی خاطر جمع ہوئی۔ اس نے سونی پت خط لکھ دیا۔

سواریاں دروازے پر آکر رکیں۔ معلوم ہوا آزاد کی بیوی اور پھوپی آئی ہیں۔ بیوی کی گود خالی تھی۔ وہ لڑکی؟ جب وہ دلی سے نکلا تھا۔ دھوبی واڑے کی گلی میں ایک گولہ آکر گرا تھا جس سے آزاد کی شیر خوار بچی بے ہوش ہوگئی تھی۔ بعد میں اسی سکتے کی حالت میں انتقال کرگئی۔ یہ کمائی بھی چھن گئی۔

آزاد نے اس پر بھی اللہ کا شکر ادا کیا اور مجمع البحرین پریس میں پرنٹر، پبلشر کے فرائض انجام دینے لگا۔ اس پریس سے اسی نام کا ایک اخبار بھی نکلتا تھا۔ یہ اخبار بھی اس کی جولانگاہ بن گیا۔ اس کی نگارشات بھی اس میں شائع ہونے لگیں لیکن وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ یہ کوئی ادبی کام نہیں۔ اخبار میں آج کا لکھا کل پرانا ہوجاتا ہے اور زیادہ تر ہنگامی موضوعات پر لکھنا پڑتا ہے جبکہ اس کے سینے میں ادیب کا دل تھا۔

اخبار اور پریس کی مصروفیات اسے کچھ سوچنے ہی نہیں دیتی تھیں۔

ایک دن ارسطو جاہ بڑی سج دھج سے تیار ہوئے، معلوم ہوا ڈائریکٹر تعلیمات پنجاب، لدھیانہ آئے ہوئے ہیں۔ ارسطو جاہ ان سے ملاقات کے لیے جارہے ہیں۔ انہوں نے آزاد سے بھی کہا کہ وہ بھی ساتھ چلے۔

لدھیانہ کے ڈاک بنگلے میں، کپتان فلر نہایت کروفر سے موجود تھے۔ خوشامدی انہیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔ ارسطو جاہ کو دیکھا تو بڑے تپاک سے ملے۔ ارسطو جاہ نے آزاد کا تعارف ان سے کروایا۔

"عربی، فارسی کے فاضل ہیں۔ اردو کے بہت اچھے انشا پرداز ہیں اور شاعر ہیں۔"

"پھر یہ آپ کے پاس کیا کررہے ہیں؟" فلر نے ہنستے ہوئے کہا۔

"حضور! یہ میرے پریس اور اخبار سے وابستہ ہیں۔"

"بہت خوب، بہت خوب۔"

اس کے بعد مسٹر فلر باتوں میں مصروف ہوگئے لیکن آزاد کسی اور دنیا میں پہنچ چکا تھا "پھر یہ آپ کے پاس کیا کررہے ہیں؟" یہ جملہ بار بار اس کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ اس کا مطلب ہے خود فلر یہ سمجھتے ہیں کہ پریس اور اخبار میری منزل نہیں۔ مجھے تو کہیں اور ہونا چاہیے۔

اس کا یہ خواب اس وقت ٹوٹا جب ملاقات کا وقت ختم ہوا۔ اس نے ایک خاص عقیدت کے ساتھ مسٹر فلر سے ہاتھ ملایا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

اس ملاقات کے بعد اچانک اس کا دل جگراؤں سے اچاٹ ہوگیا تھا۔ اب ایک ہی خواب اس کی آنکھوں میں سمایا ہوا تھا کہ وہ لاہور جاکر محکمۂ تعلیم میں ملازمت کی کوشش کرے۔ اتفاق سے لاہور میں ایک سہارا بھی موجود تھا۔ اس کے پھوپی زاد بھائی محمد علی پوسٹ ماسٹر جنرل کے دفتر میں ہیڈ کلرک تھے۔ اس نے انہیں خط لکھا اور ۱۸۶۷ء میں یہاں سے بھی رشتہ سفر باندھ لیا۔

پرندہ کتنا ہی پھڑپھڑائے، پنجرا اپنی مرضی سے تو نہیں کھول سکتا۔ یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ لاہور پہنچتے ہی مراد پوری ہوجاتی۔ اس نے بھائی کے کہنے سے عارضی طور پر پوسٹ آفس میں ملازمت کرلی۔

یہ ملازمت اس کی امنگوں کے مطابق بھی نہیں تھی اور

مشاہرہ بھی صرف تیس روپے ماہوار تھا۔

وہ دیکھ رہا تھا کہ اس کے اور ساتھی جو دہلی کالج میں اس کے ہم سبق تھے' اس سے بہت آگے نکل چکے ہیں۔ مولوی نذیر احمد ڈپٹی کلکٹر ہوگئے۔ مولوی ذکاء اللہ مدارس کے ڈپٹی انسپکٹر۔ اپنے اردگرد بھی دیکھتا تھا تو کم اہلیت کے لوگ اس سے آگے نظر آتے تھے۔ اس کے دل کا کنول بجھنے لگا۔ اس کے دن اطمینان اور راتیں ذہنی سکون کے لیے ترسنے لگیں۔ خاموشی سے گھر چلا آتا' چپکے سے گھر سے نکل جاتا۔ پھر ایک دن اس نے مسٹر فلر کے نام خط لکھا جس میں اس نے ڈاک بنگلے کی ملاقات کا ذکر خاص طور پر کیا لیکن اب وہ ملاقات انہیں کہاں یاد رہی ہوگی۔ پروانۂ ملاقات جاری نہ ہوسکا۔

وہ قسمت سے لڑتا رہا اور پوسٹ آفس میں ملازمت کرتا رہا لیکن اس عالم میں بھی اس کا دماغ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے مضطرب رہتا تھا۔

۱۸۶۴ء میں اس نے لڑکیوں کی تعلیم سے متعلق ایک کتاب ''آئینہ صحت'' لکھ کر گورنمنٹ کے سامنے پیش کی لیکن حوصلہ افزائی نے یہاں بھی اس سے منہ پھیرلیا۔ گورنمنٹ کی طرف سے جواب آیا۔

''کتاب مفید معلوم ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے سائل نے بہ صلاح ارباب کمیٹی سکھشا سبھا لاہور سے واسطے تعلیم مکاتب زنانہ تصنیف کی ہے پس وہی صاحب کمیٹی اس کے چھپوادیں گے۔ اس وقت ہم واسطے انعام کے گورنمنٹ میں رپورٹ کریں گے۔''

سکھشا سبھا نے بھی کوئی توجہ نہیں دی اور یوں اس کی یہ پہلی تصنیف زمانے کی آنکھ سے پوشیدہ ہی رہ گئی۔

ابھی وہ اس ناانصافی کو بھولا نہیں تھا کہ اس کا تبادلہ ملتان کردیا گیا۔ ہرچند کہ اسے ترقی دے کر بھیجا جارہا تھا لیکن اسے لاہور سے باہر جانا منظور نہیں تھا۔ اس نے یہ سوچے بغیر کہ اب وہ کیا کرے گا' ڈاک کے دفتر کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔

کہاں وہ دہلی کا شاندار اثر آفریں ماحول کہاں یہ لاہور کی غریب الوطنی۔ وہ لاہور کی وسیع فضا میں اپنے لیے جگہ تلاش کررہا تھا۔ جب قسمت میں خرابی ہو تو کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی۔ وہ افسران کو چٹھیاں لکھ لکھ کر تھک گیا لیکن محکمۂ تعلیم میں اس کی ملازمت کا بندوبست نہ ہوسکا۔

اس نے تھک ہار کر پرانی اور نادر کتابوں کی تجارت شروع کردی۔ جہاں سے کوئی اچھی کتاب ملتی' خرید لیتا۔ پھر بڑے بڑے افسروں کو خط لکھتا کہ اس کے پاس فلاں نادر کتاب برائے فروخت موجود ہے۔

قطعہ تاریخ وفات از مولانا الطاف حسین حالی

آزاد وہ دریائے سخن کا دُرِ یکتا
جس کی سخن آرائی پہ اجماع تھا سب کا
ہر لفظ کو مانیں گے فصاحت کا نمونہ
جو اس کے قلم سے دمِ تحریر ہے ٹپکا
ملکوں میں پھرا مدتوں تحقیق کی خاطر
چھوڑا نہ دقیقہ بھی کوئی رنج و تعب کا
دیکھا نہ سنا ایسا کہیں اہلِ قلم میں
تصنیف کا تدوین کا تحقیق کا لپکا
صحت میں علالت میں اقامت میں سفر میں
ہمت تھی بلا کی تو ارادہ تھا غضب کا
فرض اپنا ادا کرکے کئی سال سے مشتاق
بیٹھا تھا کہ آئے کہیں پیغام طلب کا
آخر شبِ عاشور کو تھی جس کی تمنا
آپہنچا نصیبوں سے بلاوا اسے رب کا
تاریخِ وفات اس کی جو پوچھے کوئی حالی
کہہ دو کہ ہوا خاتمہ اردو کے ادب کا

یہ تجارت اس کے لیے ذریعۂ معاش بھی تھی اور اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ بڑے بڑے افسروں سے اس کے تعلقات استوار ہونے لگے۔

ایک دن وہ صبح کی سیر کو نکلا ہوا تھا کہ پنڈت من پھول سے ملاقات ہوگئی۔ پنڈت جی دہلی کالج کے تعلیم یافتہ تھے اور لاہور میں گورنر پنجاب کے محکمے میں میر منشی کے عہدے پر فائز تھے۔ آزاد سے اکثر ملاقاتیں رہتی تھیں۔

''بھئی آزاد' تم اس وقت خوب ملے۔ ایک الجھن تھی مگر یقین ہے اب نہیں رہے گی۔ یہ بتاؤ ایجاد مذکر ہے یا مؤنث؟''

''خیریت ہے پنڈت جی! کیا ایجاد کرلیا۔''

''میجر فلر صاحب نے کوئی تحریر اردو میں لکھی ہے۔ اس میں لفظ ایجاد استعمال ہوا ہے۔ میجر صاحب کو یہ تحقیق کرنی ہے کہ ایجاد مذکر ہے یا مؤنث!''

''مذکر ہے۔''

''یہی خیال مولوی کریم الدین سررشتے دار کا بھی تھا لیکن فلر صاحب کو سند درکار ہے۔ آپ کے پاس کوئی سند ہے۔''

''بھئی' اگر آپ مرزا سودا کو سند مانتے ہیں تو فلر صاحب کو

یہ شعر سنا دیجئے گا۔"

ہائے کس بھڑوے کا یہ ایجاد ہے
نسخے میں مجنوں زر نباد ہے

پنڈت جی کی الجھن دور ہو گئی اور آزاد کی ملازمت کا بہانہ بن گیا۔

پنڈت من پھول نے یہ واقعہ من و عن فلر صاحب کے گوش گزار کر دیا۔

"اس آدمی سے تو میں مل چکا ہوں۔ اس کے کئی خط بھی مجھ تک پہنچے ہیں۔" فلر نے کہا۔

"حالات کا ستایا ہوا ہے۔ نہایت قابل ہے لیکن قسمت یاوری نہیں کرتی۔ محکمۂ تعلیم میں ملازمت کے لیے کئی سال سے لاہور میں پڑا ہوا ہے۔"

آزاد کا نام وہ سن ہی چکے تھے۔ اس واقعے نے اس کی علمیت کا سکہ ان کے دل پر جما دیا بالآخر دو سال بے کار رہنے کے بعد ۱۸۶۴ء میں اس کا تقرر محکمۂ تعلیم میں ہو گیا۔

ایک مرتبہ پھر مُردے میں جان پڑ گئی۔ دلی مراد پوری ہوئی۔ حوصلے بیدار ہو گئے۔ عمر کی فصل بہار گزر چکی تھی لیکن ابھی اتنی دور نہیں گئی تھی کہ آواز نہ دی جا سکے۔ محکمہ تعلیم سے منسلک ہوتے ہی علمی سرگرمیوں میں مصروف ہو گیا۔ قواعد عربی کا ایک مسودہ تیار کر کے حکومت کو پیش کیا۔ سرکاری مدارس کے لیے ایک کتاب لکھنے کی اجازت مانگی۔ منطق پر ایک رسالہ لکھا۔ سررشتہ تعلیم کے لیے ابتدائی کتابیں لکھیں جو مدرسوں میں پڑھائی جانے لگیں۔ یہ سب تو تھا لیکن اس کا ادبی ذوق اب بھی کسی کونے میں بند پڑا تھا۔ جس کے قلم سے ادب کے شاہکار جنم لے سکتے تھے، وہ تعلیمی کتابیں لکھنے میں مشغول تھا۔ بچوں کو قواعد نویسی سکھا رہا تھا۔ اس کا افسوس اسے عمر بھر رہا۔

"کاش وہ دن جو میری عمر کی فصل بہار تھے۔ طبیعت جوان تھی۔ جوش ٹپکتے تھے، مضامین برستے تھے اور رنگ اڑتے تھے، ان تصانیف میں خرچ ہوتے جن سے میرے دل کے ارمان نکلتے ... لیکن بندگی بے چارگی۔ آخر کو نوکر تھا۔ وہ نہ کرتا تو کیا کرتا۔"

اس بندگی بے چارگی کے باوجود وہ اپنی صلاحیتوں سے بے نیاز نہ رہ سکا اور اس نے اپنی پہلی ادبی کاوش "گلزن پھول" کے نام سے تصنیف کی۔ یہ تصنیف تعلیم نسواں کے موضوع پر لکھی گئی تھی لیکن زبان و بیان کی شگفتگی نے اسے ادبی تحریر بنا دیا۔ قدیم و جدید کے امتزاج سے اس نے ایک نیا رنگ تخلیق کیا تھا۔ اس تحریر میں داستانی دور کی رنگینی بھی تھی اور جدید دور کی سادگی بھی۔ قصہ گوئی کی ایسی دلچسپ مثال پیش کی تھی جو اس کے شاندار مستقبل کی پیش گوئی کرتی تھی۔

۱۸۶۴ء میں گورنمنٹ کالج آف لاہور کا قیام عمل میں آیا اور ڈاکٹر لائٹنر اس کالج کے پرنسپل مقرر ہو کر لاہور آئے۔

آزاد اپنی آمدنی کو بڑھانے کے لیے ملازمت کے ساتھ ساتھ انگریزوں کو اردو بھی پڑھاتا تھا۔ لائٹنر نے اس کی شہرت سنی تو اسے اپنا ٹیوٹر مقرر کر لیا۔

مسٹر لائٹنر بڑے لائق اور زبانوں کی تحقیق کے مرد میدان تھے۔ آزاد ہی کی طرح انقلابات زمانہ کی سختیاں جھیل چکے تھے لہٰذا یہ دو روحیں ایسی ملیں کہ پانچ مہینے کی ٹیوٹری ہمیشہ کی دوستی میں تبدیل ہو گئی۔ اب آزاد کا بیشتر وقت ان کے ساتھ گزرنے لگا۔ اس قربت نے لائٹنر کو آزاد کی علمیت کا معترف بنا دیا۔ لاہور میں جو چند قابل ترین لوگ تھے، آزاد کا شمار ان لوگوں میں ہونے لگا۔

محکمۂ تعلیم کی ملازمت اور لائٹنر کی ہمت افزائی نے آزاد کے حوصلے بہت بلند کر دیے اور وہ نئے عزائم کے ساتھ کارزار حیات میں شریک ہو گیا۔

لائٹنر نہایت عملی آدمی تھے۔ کچھ نہ کچھ کرتے رہنا ان کی فطرت میں شامل تھا۔ جب کچھ دن انہوں نے لاہور میں گزار لیے تو انہیں ایک ایسی انجمن بنانے کا خیال آیا جس میں ادبی اور فنی مضامین پڑھے جائیں اور ان لیکچروں کو کتابی صورت میں شائع کرا کے ملک میں پھیلایا جائے۔ انہیں حکومت کی سرپرستی بھی حاصل تھی اس لیے یہ کام ان کے لیے مشکل نہیں تھا۔

اپنی اس تجویز کو، رئیسان لاہور سے مشورے کے بعد بہت جلد عملی صورت دے دی۔

۲۱ جنوری ۱۸۶۵ء کو سکھشا سبھا کے مکان میں لاہور کے سربرآوردہ لوگوں کا جلسہ ہوا۔ ان لوگوں میں زیادہ تر سرکاری ملازم تھے۔ پنڈت من پھول میر مجلس تھے جنہوں نے ابتدا میں اس جلسے کی غرض بیان کی۔

"اے صاحبان! ہم کئی برس سے اس بات کی فکر میں تھے کہ مثل شاہ جہاں پور، بریلی اور کلکتہ وغیرہ۔ اس شہر لاہور میں بھی ایک مجلس نامی گرامی عالم و فاضل افراد کی مقرر کی جائے جس میں ترقی علم و ہنر کے خیالات تحریری اور تقریری انداز میں سامنے آئیں۔"

اس کے بعد انہوں نے لائٹنر کی علم دوستی اور ان کی

کوششوں کو بیان کیا۔

انجمن کا نام انجمن مطالب مفیدہ پنجاب رکھا گیا۔ من پھول صدر اور منشی ہر سکھ رائے کو سیکریٹری مقرر کیا گیا۔

انجمن کے ممبران میں دوسرے بہت سے لوگوں کے ساتھ آزاد کا نام نامی بھی تھا۔

اسے یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ انجمن کے ذریعے وہ اپنی خداداد صلاحیتوں کو دنیا کے سامنے پیش کر سکتا ہے چنانچہ اس نے پورے جوش کے ساتھ انجمن کی کارروائیوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔

وہ صرف رکن نہیں تھا جو اس انجمن کی ترقی کے لیے کام کرتا رہتا۔ وہ اپنا شمار ان لوگوں میں کرانا چاہتا تھا جن کے لیے نامی گرامی عالم وفاضل کے الفاظ استعمال کیے گئے تھے چنانچہ اس نے نہایت تحقیق اور محنت کے بعد ایک مضمون "دربابِ رفعِ افلاس" تیار کیا اور گیارہ فروری ۱۸۶۵ء کے جلسہ عام میں پبلک کے سامنے پیش کیا۔

اس مضمون کے بعد چوبیس فروری کے جلسے میں اس نے ایک اور مضمون "اہل ہند کو اپنے سود بہبود میں خود کوشش کرنی چاہیے" پڑھا۔

تین مارچ کے جلسے میں اس کی قابلیت کو دیکھتے ہوئے اسے کمیٹی امتحان زبان عربی کا ممبر مقرر کیا گیا۔ ۷ اپریل کے جلسے میں اس نے ایک اور مضمون "ترقی تجارت ہندوستان" پڑھ کر سنایا۔

چودہ اپریل کے جلسے میں اسے کمیٹی ترقی سررشتہ تعلیم کا رکن مقرر کیا گیا اور ۱۹ اپریل کو اس نے ایک مضمون ارتباط سلاطین سابق وحال پڑھ کر سنایا۔

انجمن کا اجلاس ہر ہفتے ہوتا تھا اور وہ ہر ہفتے ایک نیا مضمون لے کر حاضر ہو جاتا تھا۔ چند جلسوں کے بعد ہی اس کا نام چمکنے لگا۔ دور دور شہرت ہونے لگی۔

جب تک وہ گمنام تھا، کوئی بات تک پوچھنے کا روادار نہیں تھا لیکن جونہی اس کے مراتب میں اضافہ ہونے لگا، اس کے حاسد پیدا ہونے لگے۔

اس کے قریبی عزیزوں میں سے ایک صاحب مرزا محمد علی اس کے بڑھتے ہوئے رسوخ کو نہ دیکھ سکے۔ انہوں نے خفیہ طور پر گورنمنٹ کو اطلاع دی کہ محمد حسین آزاد وہی شخص ہے جس کے باپ کو غدر کے بعد مسٹر ٹیلر کے قتل کے الزام میں گولی سے اڑا دیا گیا تھا اور خود اس کے وارنٹ گرفتاری جاری ہو گئے تھے مگر اب تک یہ آزاد پھرتا ہے۔

غدر ہوئے کئی سال بیت گئے تھے لیکن گورنمنٹ ایسے لوگوں سے اب بھی خائف تھی۔ اس مخبری کا خاطر خواہ اثر ہوا اور اس کے خلاف تحقیقات شروع ہو گئیں۔

یہ معمولی بات نہیں تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنی ترقی کا شیش محل بنایا تھا۔ ذرا سی ٹھیس اسے کانچ کے ٹکڑوں میں تبدیل کر سکتی تھی۔ الزام غلط بھی نہیں تھا کہ وہ مطمئن رہتا۔ بات ایسی بھی نہیں تھی کہ دل میں رکھ لیتا۔ یہ خبر جیسے ہی اسے ملی اور گھر تک پہنچی، ایک کہرام برپا ہو گیا۔ دلی کی بربادی پھر آنکھوں کے سامنے گھومنے لگی۔

کچھ لوگوں سے امید تھی جو اس مشکل وقت میں کام آسکتے تھے۔ اس نے انہیں خط لکھ کر صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ ڈاکٹر لائٹنر نے بھی اسے تسلی دی کہ وہ اسے اس الزام سے بری کرانے کے لیے کوشش کریں گے۔

امیدیں تو سبھی دلاتے ہیں۔ دیکھیے کس کی کوشش بارور بھی ہوتی ہیں۔ ایک دھڑکا تھا کہ جان کے ساتھ لگا ہوا تھا کہ دیکھئے کب کیا خبر آتی ہے۔

آخر وہ گھڑی آپہنچی۔ شملے میں اس کی طلبی ہوئی تھی کہ وہ اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے فوراً شملہ پہنچے۔

وہ کئی مرتبہ شملہ گیا تھا لیکن یہ گھڑی کچھ اور تھی۔ وہاں سے واپس آنا نصیب بھی ہوگا کہ نہیں۔ وہ گھر میں سب کو روتا چھوڑ کر، ڈگمگاتے قدموں سے شملہ پہنچ گیا۔

ڈاکٹر لائٹنر اور ارسطو جاہ کی کوششیں رنگ لائیں۔

خراجِ عقیدت

"سرسید سے معقولات الگ کر لیجئے تو کچھ نہیں رہتے۔ نذیر احمد بغیر مذہب کے لقمہ نہیں توڑ سکتے۔ شبلی سے تاریخ لے لیجئے تو قریب قریب کورے رہ جائیں گے۔ حالی بھی جہاں تک نثر کا تعلق ہے سوانح نگاری کے ساتھ چل سکتے ہیں۔ آزاد صرف انشاء پرداز ہیں جن کو کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں۔"

(مہدی افادی)

"آزاد کی ادبی شخصیت ایک ہشت پہلو نگینہ ہے۔ اس کا جو رخ بھی ہمارے سامنے آتا ہے، وہ اپنی تابناکی سے نگاہوں کو خیرہ کر دیتا ہے۔ اس نگینے کی تراش، رنگ روپ، وزن سب اہم ہیں لیکن ان کی انشاپردازی ان کی باقی تمام خصوصیات پر فوقیت رکھتی ہے۔"

شملہ میں اس سے سوال جواب ضرور ہوئے لیکن وہ مجرم قرار نہیں پایا اور شملہ سے سرخرو واپس ہوا۔

○☆○

انیسویں صدی کے نصف اول پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذریعے ہندوستان پر برطانیہ کا قبضہ مستحکم ہو چکا تھا لیکن ہندوستان کی شمال مغربی سرحدوں کی کنجی ابھی تک اس کے ہاتھ میں نہیں آئی تھی۔

برطانیہ اس بات سے پریشان تھا کہ روس نے آہستہ آہستہ ایشیا میں جنوب کی طرف پاؤں پھیلانا شروع کر دیئے ہیں۔ وسط ایشیا کا یہ علاقہ روس کے لیے گویا گھر کا پچھواڑا تھا۔ جب جی چاہے وہ وہاں اپنی فوجیں بھیج سکتا تھا۔ برطانیہ کی طرح اسے سمندر پار کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

برطانیہ نے افغانستان کو اپنے زیر اثر لا کر روس کے راستے میں خندق بنانے کی کوشش کی۔ ادھر روس نے افغانستان کے شمال میں ترکستان کی طرف قدم بڑھائے۔ دیکھتے ہی دیکھتے تاشقند، خوقند اور سمرقند روس کے اثر میں آگئے۔ دریائے سیحوں تک روس کی فوجی چھاؤنیاں بن گئیں۔ بخارا، بدخشاں اور پورا ترکستان روس کے زیر اثر آنے کو تھا۔

برطانیہ کو روس کی اس پیش قدمی سے یہ خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ کہیں وہ افغانستان سے ہوتا ہوا ہندوستان تک نہ پہنچ جائے۔

اس کا راستہ روکنا تھا لیکن حالات سے پوری طرح آگاہی نہیں ہو رہی تھی۔ نہ ریڈیو تھا نہ تار برقی کا سلسلہ کہ پل پل کی خبریں آنکھ جھپکتے دنیا کے ہر گوشے سے حاصل ہو جاتیں۔ فوجوں کی چڑھائی اور لڑائی کی خبریں عموماً سیاحوں اور مسافروں کی زبانی پہنچتی تھیں اور وہ بھی مبالغہ آمیز اور ادھوری۔

جب خطرہ بہت بڑھنے لگا اور روس کی لشکر کشی کے حالات جاننے کی ضرورت لازمی ہو گئی تو گورنر پنجاب نے وسط ایشیا کے حالات معلوم کرنے کے لیے ایک خفیہ جاسوسی مشن بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ حکومت پنجاب نے اس مقصد کے لیے چار آدمیوں کا انتخاب کیا۔ پنڈت من پھول، محمد حسین آزاد، منشی فیض بخش اور کرم چند نند رام۔

آزاد کو اس سفر کی دشواریوں کا پوری طرح علم تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر وہ جاسوسی کے الزام میں گرفتار ہو گیا تو حکومت ہندوستان اسے بچا نہیں سکے گی۔ اس نے یہ افسانے بھی سنے تھے کہ ترکمان قزاق، قافلوں پر دن دہاڑے چھاپے مارتے ہیں۔ وسط ایشیا میں بردہ فروشی عام ہے۔

دوسری طرف یہ لالچ بھی تھا کہ سمرقند و بخارا، بدخشاں وغیرہ کے وہ علاقے جن کا تذکرہ صرف کتابوں میں پڑھا ہے، انہیں دیکھنے کا موقع ملے گا۔ ترکی، فارسی اور عربی زبانوں سے شغف نے بھی اسے اس سفر پر اکسایا۔

وہ عجیب گومگوں کے عالم میں تھا۔ جان کو ہلاکت صاف نظر آ رہی تھی۔ جان ہتھیلی پر رکھ کر اس سفر پر روانہ ہونا ہوگا۔ پھر بھی یہ ضرورت نہیں کہ زندہ سلامت اس سفر سے واپس آجاؤں۔

یہ مشن اتنا خفیہ تھا کہ کسی کو بتا بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ کس مہم پر جا رہا ہے۔ مشورہ تو دور کی بات ہے۔ پھر اس نے خود ہی سوچا کہ اگر یہ خیریت واپس آگیا تو انگریزوں کی قربت اسے نصیب ہو جائے گی۔ ہندوستان کی بغاوت میں حصہ لینے کا جو الزام اس پر ہے وہ بھی دھل جائے گا اور بقیہ عمر اطمینان سے ادبی کام کرنے کا موقع ملے گا۔ اس کے مناصب میں اضافہ ہوگا۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کر اس سفر پر جانے کی حامی بھر لی۔

جیسے جیسے سفر کا وقت قریب آ رہا تھا، اسے اپنے اہل و عیال کی فکر ستا رہی تھی۔ وہ اس نئے شہر میں اکیلے کیسے رہیں گے۔ سفر ایسا درپیش تھا کہ واپسی کا کوئی وقت معین نہیں تھا۔ اس نے یہی مناسب سمجھا کہ بیوی کو اس کے میکے، دلی بھیج دیا جائے۔ اس نے اپنی مصروفیات کا بہانہ کیا اور بیوی بچوں کو دلی بھیج دیا۔

ان چاروں آدمیوں نے اپنے حلیے تبدیل کیے اور فرضی نام اختیار کر لیے۔ آزاد نے اپنا نام بہاؤالدین تجویز کیا اور ایک غریب طالب علم کا روپ دھارا جو بخارا، تعلیم حاصل کرنے کے لیے جا رہا تھا۔

حکومت پنجاب نے ایک سوال نامہ ان لوگوں کو دیا۔ اس سوال نامے کی مدد سے انہیں وہ معلومات جمع کرنی تھیں جو حکومت چاہتی تھی۔

پنڈت من پھول اس وفد کی سربراہی کر رہے تھے۔ وہ ہدایات لینے کوہ مری پہنچے اور آزاد پشاور روانہ ہو گیا۔

کوہ مری میں حکومت پنجاب کے سیکریٹری نے من پھول کو فرماں روائے کابل کے نام تعارفی خط دیا اور پشاور کے کچھ تاجروں کے نام چٹھیاں دیں جن میں وفد کے ممبروں کی مدد اور مالی اعانت کی ہدایات درج تھیں۔

پنڈت من پھول کوہ مری سے ایبٹ آباد آئے جہاں انہوں نے کرنل میچر سے ملاقات کی۔

ایبٹ آباد میں پنڈت من پھول نے مشہور کرا دیا کہ وہ تبدیلی آب و ہوا کے لیے کشمیر جا رہے ہیں تاکہ اس مشن کا راز کسی پر ظاہر نہ ہو جائے۔

پنڈت من پھول یہ چکما دے کر کشمیر جانے کے بجائے پشاور آ گئے جہاں وفد کے دوسرے لوگ ان کے منتظر تھے۔

پشاور سے یہ چاروں افراد الگ الگ قافلوں میں کابل کے لیے روانہ ہوئے۔ گویا تمام افراد ایک دوسرے سے لاتعلق تھے۔

آزاد ایک طالب علم کے روپ میں سفر کر رہا تھا لہٰذا اسے پوری اداکاری کرنی تھی' ایک طالب علم کے پاس اتنے پیسے نہیں ہوتے کہ وہ اشیائے خورونوش پر خرچ کرتا پھرے چنانچہ جہاں قافلہ رکتا۔ یہ غریب طالب علم چند پیسوں میں اپنا پیٹ بھر کر قافلے والوں کو یقین دلاتا کہ وہ کوئی تاجر نہیں محض طالب علم ہے۔ کہیں روٹی اور کباب سے پیٹ بھر لیا۔ کہیں موقع ملا تو آٹا' گھی' نمک اور ماش کی دال لے کر کھانا کھا لیا۔ جلال آباد میں سردہ کھا کر اور فتح آباد میں انار کھا کر گزارہ کیا۔

کئی منزلوں کے بعد قافلے والوں میں اس کے ذوق علمی کی باتیں ہونے لگیں کہ طلب علم اسے کسی دور دراز کے مقام پر لے کر جا رہی ہے۔ بہرحال پندرہ دن کے سفر کے بعد وہ کابل پہنچ گیا۔

کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ وہ اکیلا تھا۔ اس کے ساتھی الگ الگ قافلوں کے ساتھ یا تو پہلے ہی پہنچ چکے تھے یا پہنچنے والے تھے۔

وہ جیسے ہی شہر میں داخل ہوا' سب سے پہلے اس نے سوا تین روپے کی ایک پوستین خریدی۔ اب وہ بالکل افغانی معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے اردگرد ہیبت ناک شکلوں کے قوی ہیکل افغانی' ہتھیار باندھے چل پھر رہے تھے۔ بعض آنکھوں نے اس کی طرف گھور کر دیکھا لیکن وہ برابر آگے بڑھتا گیا۔ اب اسے کسی سرائے کی تلاش تھی تاکہ وہ رہائش کے انتظام سے فارغ ہو کر کرم چند ستار کو تلاش کر سکے۔ یہ شخص سندھ کا رہنے والا تھا اور وفد میں شامل تھا۔ طے یہ ہوا تھا کہ سب ممبر ایک دوسرے سے لاتعلق رہیں گے۔ کرم چند کے ذریعے ان کے درمیان رابطہ ہوگا۔

ایک جگہ چند افغانیوں نے اسے پکڑ لیا۔ اس پر جاسوس ہونے کا شبہ تھا۔ اس نے ہاتھ جوڑے' خوشامدیں کیں لیکن وہ اسے قتل کرنے کے درپے تھے۔ موت آنکھوں کے سامنے کھڑی تھی۔ ایک بھیڑ لگ گئی تھی لیکن کوئی اس کی بات سننے

اردو کمپوزرس

اگر آپ اپنے مؤقر جریدے کی کمپوزنگ کے لئے کسی اچھے ادارے کی تلاش میں ہیں تو ہم سے رجوع کریں۔

اردو کمپوزرس

ایک معیاری کمپوزنگ کا ادارہ ھے

ہمارا ادارہ اردو کمپوزنگ کے ابتدائی اداروں میں سے ایک ہے جو کہ اردو کمپوزنگ کے سب سے اچھے پروگرام پر کام کرتا ہے۔

اپنے معیار کے متعلق اتنا بتانا ہی کافی ہوگا کہ ہمارا ادارہ پاکستان کے بڑے بڑے ماہناموں کی کمپوزنگ پچھلے دس سالوں سے کر رہا ہے۔ ان ماہناموں میں "جاسوسی ڈائجسٹ' سسپنس ڈائجسٹ' ماہنامہ پاکیزہ اور ماہنامہ سرگزشت" کے نام سرفہرست ہیں۔

ہم فن کتابت اور طباعت کی باریکیوں سے بخوبی واقف ہیں اور اغلاط سے پاک' وقت مقررہ پر کام دینے کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

اردو کمپوزرس

63-سی فیز ٹو-ایکس ٹینشن-ڈیفنس کمرشل ایریا-
مین کورنگی روڈ-کراچی-75500

فون: 5802552-5895313

ہمیں خدمت کا موقع ضرور دیں

کو تیار نہیں تھا۔

"اچھا' مان لیا تم جاسوس نہیں ہو لیکن کافر تو ضرور ہو اور ہمارے ملک میں کافر کی سزا قتل ہے۔"

"اللہ کے فضل سے میں مسلمان ہوں" آزاد نے کہا اور قرآن کی آیتیں پڑھ کر سنائیں۔ نماز سنائی کہ انہیں یقین آجائے۔

"یہ کافر ہے اور اس نے دھوکا دینے کے لیے نماز یاد کرلی ہے" لوگوں نے آوازیں لگائیں۔

"خدا کے لیے تم یہ بتاؤ کہ میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ میں مسلمان ہوں کافر نہیں ہوں۔ اگر میں ثابت نہ کرسکوں تو بے شک مجھے قتل کردینا۔"

آخر ایک بوڑھا آدمی سامنے آیا۔ آزاد نے یہی التجا اس سے بھی کی۔

"اس شخص کے کپڑے اتار دو۔ ابھی معلوم ہوجائے گا کہ یہ مسلمان ہے یا نہیں۔"

آزاد کو سربازار یہ بے عزتی برداشت کرکے اپنی جان بچانی پڑی۔

جب معلوم ہوگیا کہ یہ واقعی مسلمان ہے اور تعلیم حاصل کرنے بخارا جارہا ہے تو وہی افغانی اس سے برادرانہ پیش آئے اور انہی کے توسط سے ایک سرائے میں اس کا قیام ہوگیا۔

سفر کا آغاز ہی ایک بھیانک خواب سے ہوا تھا۔ سرعام اس کی کیسی بے عزتی ہوئی تھی۔ اسے اپنی دلی کے ایک شاعر کا یہ شعر یاد آگیا۔

مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بے کسی کی شرم

اسے افسوس ضرور ہوا لیکن یہ سوچ کر صبر بھی کرلیا کہ اس سفر میں ایسے مراحل تو آنا ہی تھے۔ ان کا اندازہ غلط بھی نہیں تھا۔ میں جاسوس ہی تو ہوں۔

ابھی دن تھا اور وہ باہر نکل سکتا تھا۔ درپیش آنے والے واقعے نے اسے بدمزہ کردیا تھا لیکن نکلنا ضروری بھی تھا۔ اسے پہلی فرصت میں کرم چند سنار کو تلاش کرنا تھا۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد وہ سرائے سے نکلا۔

دھوپ چمکنے لگی تھی لیکن سردی کی شدت میں کمی نہیں آئی تھی۔ بازاروں میں اتنی بھیڑ بھی جیسے اس شہر کے لوگوں کو کوئی کام ہی نہ ہو۔ جگہ جگہ قہوہ خانے بنے ہوئے تھے۔ ان کثیف قہوہ خانوں میں قہوے کے دور چل رہے تھے۔ کلے پائے کا شوربا پیا جارہا تھا۔ وہ بھی ایک قہوہ خانے میں پہنچ گیا۔ اس کی نگاہیں قہوے کی پیالی پر اور کان لوگوں کی باتوں پر لگے ہوئے تھے۔

اس کے اردگرد بیٹھے ہوئے لوگ سخت گھبرائے ہوئے تھے۔ ہر زبان پر لشکر کشی کے قصے تھے۔ امیر کابل ان دنوں قندھار گیا ہوا تھا۔ اس کا ایک بھتیجا سردار عبدالرحمن خاں کابل کے تخت کے حصول کے لیے بخارا میں فوجیں جمع کررہا تھا اور یہ افواہیں گردش کررہی تھیں کہ وہ بہت جلد حملہ کرنے والا ہے۔

اس نے اس وقت تو کوئی اہمیت نہیں دی لیکن جب ادھر ادھر گھوم کر اسے اندازہ ہوا کہ ہر جگہ یہی خبریں گرم ہیں تو اس کی آنکھوں کے سامنے دلی کی تباہی کا نقشہ گھوم گیا۔ جنگ شروع ہوگئی تو یہاں سے نکلنا بھی دوبھر ہوجائے گا۔ اگر جنگ چھڑ گئی تو کابل سے آگے جانا بھی خطرناک ہوجائے گا۔ یہی سوچتا ہوا وہ ان مقامات کی طرف جارہا تھا جہاں کرم چند سنار کو اس سے ملنا تھا۔ بالآخر ایک جگہ اس سے ملاقات ہوگئی۔ اس کی زبانی معلوم ہوا کہ پنڈت من پھول اس سے پہلے یہاں پہنچ چکے ہیں۔ امیر کابل سے ملاقات نہیں ہوسکی کیونکہ وہ قندھار میں ہیں۔ کرم چند بھی لشکر کشی کی افواہوں سے پریشان تھا۔

دوسرے روز ایک خفیہ مقام پر ان چاروں نے ملاقات کی اور طے ہوا کہ کابل سے فوراً نکل جانا چاہیے۔ یہ تجویز بھی پیش ہوئی کہ ہندوستان واپس چلیں لیکن اس پر اتفاق نہ ہوسکا۔ پنڈت من پھول کی ہدایت کے مطابق کابل سے نکل کر ترکستان کے سفر کے لیے سامانِ سفر باندھنا پڑا۔

ایک قافلہ تاشقرغان کی طرف جارہا تھا۔ آزاد اور ایک دوسرے ساتھی منشی فیض بخش جو غلام ربانی کے نام سے سفر کررہے تھے اس قافلے میں شریک ہوگئے۔ من پھول پہلے ہی روانہ ہوچکے تھے۔

کابل سے بخارا تک قافلے صدیوں سے برابر آتے جاتے تھے لیکن اس راستے کی صعوبتیں ضرب المثل تھیں۔ راستہ تنگ اور خطرناک دروں سے گزرتا تھا اور بعض جگہ یہ پگڈنڈی باریک لکیر بن جاتی تھی۔ ترکمان لٹیروں اور چھاپا ماروں کا خوف الگ دامن گیر رہتا تھا۔ جتنی داستانیں اس نے سنی تھیں' وہ اب انہیں خود دیکھ رہا تھا۔

کابل سے نکلتے ہی دونوں طرف بلند پہاڑ دیواروں کی طرح ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ بیچ میں شاہراہ تھی جس پر قافلہ چلا جاتا تھا۔ دونوں طرف گہرے گڑھے کہ دیکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ ذرا پاؤں بہکا اور گیا۔ ٹھہرنے کے لیے نہ کہیں سرائے

نہ منزل کا انتظام۔ جہاں قافلہ تھک جاتا وہیں ڈیرے ڈال دیتا۔ یہ تو اکتوبر تھا۔ ان پہاڑوں پر تو مئی اور جون میں بھی برف جمی رہتی تھی۔

خدا خدا کر کے بلخ آگیا۔ بلخ سے چند منزل آگے بڑھ کر قافلے نے پڑاؤ کیا۔

راستے بھر وہ عبرت کے عجیب مناظر دیکھتا آیا تھا۔ قلعہ ضحاک ویران پڑا تھا۔ اس کی فرسودہ فصیلیں اور بے شمار برج اور کنگرے دور سے اداسی اور مایوسی کی تصویر دکھا رہے تھے۔ ہزاروں خرابے اور ویرانے گمنام پڑے تھے۔ شہر کے شہر زیرِ زمین مدفون پڑے تھے۔ جا بہ جا پرانے زمانے کے پیسے اشرفیاں اور نگینے نکلتے تھے۔

جیسے ہی قافلے نے پڑاؤ کیا' گاؤں کے لوگ آ آ کر قافلے میں پھرنے لگے۔ یہ لوگ کھانے پینے کی مختلف اشیا ہاتھوں میں اٹھائے ہوئے تھے۔ ہاتھ کے بنے ہوئے قالین بھی ان کے پاس تھے۔

قافلے کے کچھ لوگوں نے جب کپڑا' سوئیاں' انگوٹھیاں اور مختلف ایسی ہی چیزیں دے کر کھانے کا سامان ان سے خریدا تو آزاد کو معلوم ہوا کہ یہ لوگ روٹیاں' انڈے' گھی' دودھ وغیرہ بیچنے کے لیے آئے ہیں ورنہ وہ تو یہ سمجھے ہوا تھا کہ میزبانی کا یہ بھی کوئی انداز ہے۔

یہ لوگ راستے کی دشواریوں کی وجہ سے یہاں سے نکل نہیں سکتے اس لیے قافلے والوں سے بڑے شوق سے مل رہے تھے اور ان سے طرح طرح کی باتیں پوچھ کر خوش ہو رہے تھے۔ زبان فارسی تھی اس لیے آزاد کو ان کی بات سمجھنے میں دشواری نہیں ہو رہی تھی۔

اس راستے کا سب سے اہم مقام تاشقرغان تھا۔ افغانستان کے اس شہر کو اس لیے اتنی اہمیت حاصل تھی کہ یہاں چین' بدخشاں' ترکستان' قندھار' ہرات وغیرہ سے راستے آکر ملتے تھے۔ یہ تجارت کی بھی بہت بڑی منڈی تھا جہاں بخارا کے لوگ سلک' شکر' روسی کاغذ اور دوسری چیزیں شمال سے لاتے تھے اور ہندوستان' افغانستان کے قافلے یہیں سے سامان خرید کر بخارا جاتے تھے۔

یہ کاروباری مرکز تھا۔ غیر ملکی یہاں آتے جاتے تھے اس لیے آزاد یہاں بے خوفی سے گھومتے رہے۔ وفد کے دیگر ارکان بھی یہاں آکر اس سے مل گئے تھے۔

یہاں کی آبادی زیادہ تر ازبک تھی اور ترکی زبان بولتی تھی۔ قافلوں کے آنے جانے کی وجہ سے فارسی زبان بھی لوگ آسانی سے سمجھ لیتے تھے۔ آزاد کو یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ یہاں کے مقامی تاجر زیادہ تر ہندو ہیں جو عموماً سندھ کے شہر شکارپور کے باشندے تھے۔

اس سے زیادہ حیرت اسے اس بات پر ہوئی کہ یہاں کے بازاروں میں بچے' عورتیں اور مرد بھیڑ بکریوں کی طرح بکنے آتے تھے۔ یہ نہ انسانیت کے خلاف جرم سمجھا جاتا تھا نہ قانون کے مطابق۔

تاشقرغان ان کی منزل نہیں تھی۔ یہاں سے انہیں اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہونا تھا چنانچہ پنڈت من پھول اور کرم چند سنار تو بدخشاں کے وارالحکومت فیض آباد کے لیے روانہ ہوگئے اور آزاد اپنے ساتھی غلام ربانی کے ساتھ ایک قافلے کے ہمراہ ترکستان روانہ ہوگیا۔

تاشقرغان سے ترکستان جانے والے قافلے آمو دریا کی جانب روانہ ہوتے تھے کیونکہ افغانستان اور ترکستان کی سرحد یہ دریا تھا۔ اس دریا کا پاٹ اس قدر چوڑا تھا کہ اسے پار کرنے میں کشتی کو ڈھائی گھنٹے لگ گئے۔ دریا کے دائیں کنارے پر ترکستان کا علاقہ تھا۔ میلوں تک بے آب و گیاہ صحرا کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔

اب اس قافلے کا رخ بخارا کی طرف تھا۔ مختلف منزلوں سے گزرتا ہوا یہ قافلہ قرشی پہنچا۔ یہ ایک قصبہ تھا جو آبادی کے لحاظ سے تاشقرغان سے بھی بڑا تھا۔ اس کے آس پاس خوبصورت باغات تھے جن میں شیریں اور لذیذ پھلوں سے لدے درخت جھوم رہے تھے۔ یہاں بھی برہ فروشی کا بازار گرم تھا۔

اس قصبے سے گزرنے کے بعد اس قافلے کو پھر ایک دشت عبور کرنا تھا۔ اس وشت میں جگہ جگہ ترکمان قبیلوں کے خیمے نصب تھے۔ ان ترکمانوں کا گزارا لوٹ مار پر تھا اس لیے قافلے کا ہر شخص چوکنا اور ہوشیار تھا۔ ایک جگہ یہ دیکھ کر آزاد پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے کہ یہ ترکمان اپنے گھوڑوں کو دنبے اور بکری کا گوشت کھلا رہے تھے۔ جلد ہی یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی کہ یہاں گھاس کا نام و نشان تک نہیں ہے۔ پھر یہ اپنے جانوروں کو گوشت نہ کھلائیں تو کیا کھلائیں؟

آمو دریا سے پندرہ دن کی مسافت کے بعد' پانی کی کمی اور سخت سردی جھیل کر وہ بخارا کے نزدیک پہنچ گیا۔

بخارا وہی شہر تھا جس کے علم و فضل مسجدوں' مدرسوں' حماموں اور قہوہ خانوں کے افسانے زبان زد خاص و عام تھے۔ اسلامی دنیا میں اسے بڑی وقعت سے دیکھا جاتا تھا۔

بخارا کے گرد فصیل کا حصار بنایا گیا تھا۔ یہ فصیل مٹی

کی بہت موٹی دیوار تھی اور شہر میں داخل ہونے کے گیارہ دروازے تھے۔ سورج چھپتے ہی شہر کے دروازے بند کردیے جاتے تھے۔

یہاں کے بازار نہایت پُررونق تھے۔ ایران' کابل اور ہندوستان تک سے تجارت کا سامان بخارا کے بازاروں میں لاکر بیچا جاتا تھا۔ اس اعتبار سے بخارا' ایشیا کی سب سے بڑی منڈی تھا۔

شہر میں جگہ جگہ سرائیں تھیں جو دن رات قافلوں کے آنے جانے کی وجہ سے بھری رہتی تھیں۔ ہندوؤں اور یہودیوں کو گھوڑوں یا گدھوں پر سواری کی اجازت نہیں تھی۔ مسلمانوں کو تمباکو پینے کی اجازت نہیں تھی۔

نمازِ مغرب کے بعد نقارہ بجاکر بازار بند کرادیے جاتے تھے۔ اس کے بعد کسی کو کاروبار کرنے کی اجازت نہیں تھی۔

شہر کے قلعے کو "آرک" کہتے تھے۔ امیر بخارا کے محلات اسی قلعے کے اندر تھے۔ قلعے کے قریب مینار کلاں تھا۔ اس مینار سے مجرموں کو پھینک کر موت کی سزا دی جاتی تھی۔

یہاں کی سیکڑوں مسجدیں اور مدرسے تو پوری اسلامی دنیا میں مشہور تھے۔

عورتیں سختی سے پردہ کرتی تھیں۔ مرد رنگ برنگ کے چغے اور عبائیں پہنتے تھے اور سر پر سفید عمامہ باندھتے تھے۔

جب آزاد وہاں پہنچا تو بخارا میں مخبری کا بازار گرم تھا۔ امیر بخارا کی طرف سے بہت سے جاسوس اس کام پر مقرر تھے کہ وہ بازاروں میں گھوم پھر کر غیر ملکی باشندوں پر نظر رکھیں۔

آزاد چونکہ منشی فیض بخش کے ساتھ تھا جو تاجر کے روپ میں سفر کررہے تھے اس لیے وہ مطمئن تھا۔ اس کا بیشتر وقت بازاروں میں گزرتا تھا اس لیے لوگوں کے خیالات جاننے کی بہت سہولت تھی۔

بے پناہ سردی کا مقابلہ کرتے ہوئے وہ بڑی ہوشیاری سے روزانہ کی رپورٹ لکھ کر اپنے لباس کی خفیہ جیبوں میں رکھتا جارہا تھا۔

روسی فوجیں تاشقند پر قبضہ کرچکی تھیں اور اب ایک اور علاقے خجند پر محاصرے کی تیاریاں ہورہی تھیں۔ امیر بخارا کی طرف سے مقابلے کی تیاریاں شروع ہونے لگی تھیں۔ کابل کی طرح یہاں بھی جنگ کا ماحول تھا اور آزاد کو ابھی اور آگے جانا تھا۔

وہ بخارا سے نکلا اور ڈیڑھ سو میل کے فاصلے کو طے کرکے سمرقند پہنچ گیا۔ اب منشی فیض بخش اس کے ساتھ نہیں تھے' وہ اکیلا تھا۔

سمرقند کی خوبصورتی' اس کی عمارتوں کی دلکشی اور آب و ہوا کے مداح مغرب و مشرق کے تمام سیاح تھے۔

اس شہر کے بارے میں آزاد نے تزکِ بابری میں پڑھا تھا کہ دنیا کا سب سے خوبصورت شہر ہے۔ جیسے اعلیٰ پائے کے فقیہہ اور امام یہاں ملتے ہیں ان کی کوئی اسلامی شہر مثال پیش نہیں کرسکتا لیکن آزاد جب یہاں پہنچا تو ابتری اور بدحالی کا دور تھا۔ روسی حملے کے خوف سے لوگوں کے چہرے پیلے پڑے ہوئے تھے۔ ہر طرف دھول اڑ رہی تھی۔

اس نے جلدی جلدی اس شہر کو گھوم پھر کر دیکھنا شروع کیا۔ اس نے وہ مسجد دیکھی جس کی محراب پر قرآن شریف کی آیات اس قدر جلی حروف میں لکھی ہوئی تھیں کہ ایک میل سے انہیں پڑھا جاسکتا تھا۔

اس نے گور امیر کی سیاحت بھی کی۔ یہاں امیر تیمور دفن ہے۔ تیمور کی قبر کا تعویذ سنگ سیاہ کا تھا اور اس میں بال پڑا ہوا تھا۔ معلوم کرنے پر اسے معلوم ہوا کہ ایک روایت کے مطابق جب نادر شاہ نے سمرقند فتح کیا تو اس پتھر کو توڑنے کی کوشش کی تھی جس کی وجہ سے یہ بال پڑگیا۔ قبر پر ایک جھنڈا رکھا تھا جو عام عقیدے کے مطابق تیموری فتوحات کی یادگار تھا۔

اب تک وہ اس علاقے میں سفر کررہا تھا جہاں امیر بخارا کی حکومت تھی۔ سمرقند سے نکلنے کے بعد وہ دریائے جیحوں کے کنارے کھڑا تھا جس کے اس پار وہ علاقے تھے جو روس کے قبضۂ اقتدار میں آچکے تھے۔ یہاں پہنچ کر اسے یہ معلوم کرنا تھا کہ روسی فوجوں کی تعداد کتنی ہے۔ توپیں کتنی ہیں۔ فوج میں اصل روسی کتنے ہیں۔ کیا مسلمان بھی شامل ہیں' وغیرہ وغیرہ۔

رستے میں کئی منزلیں ایسی ملیں کہ جہاں سرائے یا مکان کچھ نہ تھا۔ زمین پر کمر کمر برف چڑھی تھی اور اِدھر اُدھر پہاڑ برف سے سفید دکھائی دیتے تھے۔ جب قافلہ کہیں پڑاؤ کرتا تھا اور آگ جلانی پڑتی تھی تو برف ہٹاکر زمین نکالنا اور لکڑیاں جمع کرنا دشوار ترین کام ہوتا تھا۔

دریائے سیحون سردی کی شدت سے جم گیا تھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے یہ دریا نہیں کسی نے شیشے کا بڑا تختہ بچھادیا ہو جس پر سے قافلے بلا تکلف آ اور جارہے تھے۔

روسی عملداری میں اس وقت برطانوی رعایا کے کسی فرد کا قدم رکھنا گویا موت کے منہ میں جانا تھا۔ آزاد کی پامردی کہ وہ بے جھجک بخارا کی سرحد عبور کرکے روسی علاقے میں داخل ہوگیا۔

اس علاقے میں پہنچتے ہی اس نے طالب علم کا چولا اتار پھینکا اور اپنے آپ کو درویش یا قلندر ظاہر کرنے لگا۔

کسی منزل پر رات کو اس نے قیام کیا۔ سردی کے موسم میں سب سے گرم جگہ سرائے میں تندور کے پاس ملی۔ یہ وہیں لیٹ گیا۔ چراغ کی روشنی میں اس نے دیکھا کہ ایک شخص جو بالکل اس جیسا تھا' سامنے کھڑا ہے۔ پہلے تو اس نے اسے اپنا وہم سمجھا لیکن جب یہ شخص اس کے پاس آکر بیٹھا تو اس پر گھبراہٹ طاری ہوئی اور اس وقت تو وہ بالکل ہی ڈر گیا جب اس شخص کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔

"میرا نام محمد حسین ہے" اس کے ہم شکل نے اپنا تعارف کرایا۔

آزاد اس سفر میں بہاؤالدین کے نام سے سفر کر رہا تھا۔ اس کا اصل نام کسی کو بھی معلوم نہیں تھا۔ اس کی زبان سے اپنا نام سن کر آزاد کو یقین ہو گیا کہ اس کا راز فاش ہو گیا اور اب جان کی خیر نہیں۔ خوف سے اس کی رگوں میں خون جم گیا۔ اٹھنے کی سکت نہیں تھی لیکن وہ ہمت کر کے اسی وقت سرائے سے روانہ ہو گیا۔

وہ شخص کون تھا؟ آزاد کا ہمزاد؟ یہ معما وہ کبھی حل نہ کر سکا۔ شاید یہ اس کا وہم ہی ہو۔

یہ وہاں سے نکلا اور خوقند' خجند اور تاشقند ہوتے ہوئے شمال میں چم کنت تک پہنچ گیا۔ یہی نہیں بلکہ وہ دریائے آرس کے کنارے تک پہنچ گیا۔ یہ وہ علاقہ تھا جہاں روس کے قبضے کے بعد کسی غیر ملکی باشندے کے قدم یہاں نہیں پہنچے تھے۔

وہ ان علاقوں کے ایک ایک گاؤں میں گھوما' مسجدوں میں ٹھہرا' مدرسوں کی خاک چھانی' محاذوں کی طرف نکل گیا۔ روسی توپوں کے گولوں کی آوازیں سنیں۔ کسی نے دیکھ بھی لیا تو کوئی مجذوب فقیر سمجھ کر اس سے تعرض نہیں کیا۔ اس کی حالت اب ہو بھی ایسی گئی تھی کہ کوئی اسے مجذوب ہی سمجھتا۔ نہائے ہوئے مہینوں گزر گئے تھے۔ بال اجڑے ہوئے' کپڑوں میں جوئیں۔ جہاں جگہ مل جاتی' لیٹ جاتا۔ جہاں کھانے کو مل جاتا کھا لیتا۔ دیوانے کا روپ دھار کر وہ روسی فوجوں کی معلومات اور ان کے ٹھکانے قلمبند کرتا رہا۔ نقشے بناتا رہا۔

○☆○

پنڈت من پھول آزاد کے ترکستان روانہ ہونے کے وقت بدخشاں میں ٹھہر گئے تھے۔

جب سات آٹھ مہینے گزر گئے اور ترکستان سے آزاد کی

نمونہ کلام

متردد ہے دل کہوں نہ کہوں
پوچھتے ہیں وہ مدعا میرا
ہر نگہ میں ہیں سیکڑوں ارماں
کوئی دیکھے تو دیکھنا میرا
پاس تم کو اگر نہیں تو نہ ہو
اے بتو! کیا نہیں خدا میرا
لیے جاتے ہو تم کہاں دل کو
ہے وہ مدت سے آشنا میرا

شب نشے میں جو رخِ یار سے پردہ اٹھا
لطف دور شبِ مہتاب سے کیا کیا اٹھا
خلق سے اٹھ گئے پرسنگ در جاناں سے
روشِ نقشِ قدم پاؤں نہ اپنا اٹھا
جل گئے سوز نہاں سے جگر و دل شاید
دیکھنا روزنِ سینہ سے دھواں سا اٹھا
شعر گوئی کا تو رکھتا نہیں دعویٰ آزاد
ہاں پر استاد کی صحبت میں ہے اٹھا بیٹھا

گزرے خموش کوئے سلامت روی میں ہم
ہم نے برا سنا نہ کسی کو برا کہا

جہاں کے حسن ہیں تم میں کہ شاہ حسن ہو تم
جو عیب پوچھو جہاں کے تو اس غلام میں ہیں

جہازِ عمرِ رواں پر سوار بیٹھے ہیں
سوار خاک ہیں بے اختیار بیٹھے ہیں

ہر دم پھرے ہے ساتھ نسیم وصبا لگی
ایسی چمن میں آکے گلوں کو ہوا لگی
اس گل سے جا لگی کبھی اس گل سے جا لگی
گلشن میں ہے کسی نہ کسی سے صبا لگی

کوئی خبر نہیں آئی تو انہیں تشویش ہوئی۔ بدخشاں، ترکستان جانے والے قافلوں کے راستے سے ہٹ کر ہے اس لیے کسی مسافر سے بھی ان کی خبر نہیں مل سکتی تھی۔ آخر کرم چند سنار کو ان کی تلاش میں روانہ کیا۔ کرم چند انہیں ڈھونڈتا ہوا خوقند تک جا پہنچا اور آخر ان کا پتا لگالیا۔ منشی فیض بخش بھی مل گئے اور آزاد بھی۔

بعد میں منشی فیض بخش اور آزاد بہت سی معلومات لے کر علیحدہ علیحدہ بدخشاں کی طرف روانہ ہوئے۔ جولائی ۱۸۶۶ء میں وہ بدخشاں پہنچ گیا۔

بدخشاں کا نام جب وہ کتابوں میں لکھا دیکھتا تھا تو دل، دولت سے مالا مال ہوجاتا تھا لیکن جب آنکھ سے دیکھا تو پیٹ سے پتھر باندھنے کو جی چاہا۔

فیض آباد اس کا دارالخلافہ تھا جس کے گرد پہاڑوں کی قطاریں حفاظت کو کھڑی تھیں۔ جن پر برف سفید چادر کی طرح چڑھی ہوئی تھی۔ مخملی پہاڑ، چشمے جابجا جاری، زمین سرسبز، رنگ رنگ کے پھول۔ پورا ملک میووں سے مالا مال۔

اس سرزمین پر قدرت نے اپنی دست کاری کا تھیلا الٹ دیا تھا لیکن انسانی دست کاری بالکل مفقود تھی۔ تعلیم، صنعت گری، زراعت، تجارت وغیرہ جو سامان تحصیل دولت کے ہیں یہاں ایک بھی نہیں تھا۔ انسان تمام صاحب جمال، قوی ہیکل مگر بے ہمت اور آرام طلب۔ زراعت بقدر ضرورت کرلیتے تھے، تجارت کے لیے گھر سے باہر نکلنا پڑتا تھا اس لیے کون نکلے۔

ان کی کابلی کا یہ حال تھا کہ فیض آباد تقریباً سات سو گھروں کی بستی تھی لیکن یہاں ایک بھی نائی نہیں تھا۔ ہر شخص کی کمر میں ایک چھری لٹکی ہوئی تھی۔ چھری سے گوشت کاٹ لیتے تھے، چاقو سے ایک دوسرے کی حجامت کرلیتے تھے۔

بدخشاں میں آکر اسے کسی قدر آرام ملا تھا لہٰذا کامل چار ماہ اس ملک میں گزارے۔ یادداشتیں لکھیں۔ رپورٹ تیار۔ ان معلومات کو مرتب کیا جو وہ روسی علاقوں سے لایا تھا۔

اب واپسی کا وقت آگیا تھا۔ منشی فیض بخش تو بدخشاں سے کوہ ہندوکش کے راستے پر جلال آباد ہوتے ہوئے پشاور کی سمت روانہ ہوئے۔ آزاد، پنڈت من پھول اور کرم چند کافرستان کی طرف چلے تاکہ وہاں چترال اور دیر سے ہوتے ہوئے وطن پہنچیں۔

چاروں طرف پہاڑ۔ درختوں کا بن۔ گھاٹی ایسی تنگ کہ دو تین آدمی بہ مشکل چل سکیں۔ رستہ ایسا کہ پتھروں کے آثار چڑھاؤ پر ایک لکیر سی پڑی ہے۔ گھوڑوں کا دل تھا کہ چلے جاتے تھے۔

ان پہاڑوں پر ایسے گھنے جنگل تھے کہ دن میں بھی اندھیرا رہتا تھا۔ چشموں کی چادریں اس زور سے گر رہی تھیں کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

ان دشوار گزار پہاڑی دروں کو عبور کرکے یہ چھوٹا سا قافلہ کافرستان میں داخل ہوا۔ اس وقت کافرستان پر افغانستان کی حکومت قائم نہیں ہوئی تھی اس لیے ہر وقت چھاپے مار کافروں کا ڈر لگا رہتا تھا۔

کافروں کے نزدیک مسلمانوں کا قتل بڑا ثواب سمجھا جاتا تھا۔ جو شخص چار مسلمانوں کو قتل کرلیتا تھا، اسے برادری میں ایک خاص درجہ حاصل ہوجاتا تھا۔ اسی لیے آزاد اور ان کے ساتھی، آبادی سے دور دور رہتے تھے۔ ایک وادی میں دور سے انہیں کسی عورت نے دیکھ کر شور مچایا اور غالباً گاؤں والوں کو خبردار کرنا چاہا لیکن اس سے پہلے کہ لوگ موقع پر پہنچتے، یہ سب وہاں سے جلدی جلدی آگے بڑھ گئے اور بڑی دیر تک پہاڑوں میں چھپے رہے۔ جب یقین ہوگیا کہ کوئی تعاقب میں نہیں تو آگے بڑھے۔

اب درۂ دو راہ ان کے سامنے تھا۔ یہ درہ ۱۳ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع تھا۔ یہ درہ عبور کرکے وہ درہ لولالائی پہنچے۔ یہ مقام بھی دس ہزار فٹ کی بلندی پر تھا۔ قدم قدم پر گھوڑوں کے سم پتھروں سے ٹکرا رہے تھے مگر جان کے خوف سے برابر آگے بڑھنا پڑ رہا تھا۔

ایک دشوار گزار راستے پر پہنچے تو پگڈنڈی پہاڑ کے موڑ کے ساتھ ایک باریک سی لکیر بن گئی تھی۔ اس کے آگے نالا تھا۔ خدا پر توکل کرکے گھوڑے پانی میں ڈال دیے اور اس کے نام کی برکت سے غپر شپر کرتے پار ہوگئے۔

چترال پہنچ کر چند روز آرام کیا۔ یہاں سے نکل کر باجوڑ کے علاقے میں پہنچے۔

دیر کے علاقے سے آزاد نے انگریزی عمل داری میں قدم رکھا۔ آخر ہوتی مردان کے راستے ۷ نومبر ۱۸۶۶ء کو پشاور واپس پہنچ گئے۔

اگر سفر کی ابتدا مری سے کی جائے تو آزاد نے یہ مہم پندرہ مہینے میں تقریباً ڈھائی ہزار میل کی مسافت پیدل، گھوڑوں اور اونٹوں پر طے کی جو انیسویں صدی میں ایک تاریخی واقعہ تھا۔

وہ اپنی سسرال دلی پہنچا جہاں وہ بیوی بچوں کو چھوڑ کر گیا

تھا تو یہ معلوم ہوتا تھا جیسے مردہ' زندہ ہو کر آگیا ہے۔ کون سی منت تھی جو اس کی غیر موجودگی میں نہیں مانی گئی تھی اور اب ان منتوں کو پورا کرنے کا وقت آگیا تھا۔

سفر کی تکمیل ہو چکی تھی لیکن وہ کئی مہینوں تک پنڈت من پھول کے ساتھ مل کر رپورٹ مرتب کرتا رہا۔ پھر اسے کلکتہ جانا پڑا کیونکہ حکومت ہند کے مرکزی دفاتر کلکتہ میں تھے اور پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ کے افسر زبانی جمع خرچ کر کے روسی ترکستان کے حالات کی تحقیق کے خواہش مند تھے۔

کلکتے کے قیام میں اس نے وہاں کے ادیبوں سے ملاقاتیں کیں' کتب خانے دیکھے' مکتبوں اور مدرسوں کا معائنہ کیا' نایاب کتابیں خریدیں اور اس سفر کو بھی اپنے لیے یادگار بنالیا۔

○☆○

ترکستان کے سفر پر روانگی سے قبل ہی ایک بے قاعدگی کی وجہ سے محکمۂ تعلیم کی ملازمت ختم ہو گئی تھی۔ اس نے یہ سفر فارن ڈپارٹمنٹ کی طرف سے کیا تھا چنانچہ واپسی پر اسے چھ سو روپے کا خلعت اور سو روپے کے حساب سے چودہ ماہ کی تنخواہ مل گئی اور وہ اسی طرح حیران کھڑا رہ گیا جس طرح پہلے دن لاہور میں آیا تھا۔ بے کار بے روزگار۔

وہ بے روزگار ضرور تھا لیکن پہلے کی طرح بے سہارا نہیں تھا۔ اس نازک وقت پر ڈاکٹر لائٹنر نے اس کی دست گیری کی۔ انہوں نے آزاد کو انجمن پنجاب کا سیکریٹری مقرر کرادیا۔ یہاں سے اسے پچاس روپے ماہوار تنخواہ ملنے لگی۔

اس نے انجمن کا سیکریٹری مقرر ہونے کے بعد انجمن میں نئی روح پھونک دی۔ تھوڑے ہی دن میں یہ روشنی کا ایسا مینار بن گئی جسے دیکھنے کے لیے دور دور سے لوگ آتے تھے۔ چندہ کر کے امدادی رقوم بھیجتے تھے اور انجمن کی کامیابی کے لیے دعا کرتے تھے۔

یہ دور اس کی مضمون نگاری کے عروج کا دور تھا۔ انجمن کے جلسوں میں پڑھنے کے لیے وہ کم و بیش ہر مہینے ایک نیا مضمون تخلیق کرتا تھا۔ ہر طرف اس کی انشا پردازی کی دھوم مچ گئی۔ یہاں تک کہ خود ناظمِ تعلیمات پنجاب کو اس کی ضرورت پڑ گئی۔

انسپکٹر تعلیمات اردو زبان میں تاریخ ہند مرتب کر رہے تھے۔ اس کے لیے انہیں ایک اردو داں کی مدد کی ضرورت تھی۔ ان کی نگاہِ انتخاب آزاد پر پڑی۔ جس محکمے نے اسے باقاعدگی کے سبب ملازمت سے برطرف کر دیا تھا وہی محکمہ اسے دوبارہ ملازم رکھنے پر مجبور ہو گیا۔ جولائی ۱۸۶۸ء میں اس کا

چند اقتباسات

"ولی عہد چھپر کھٹ میں پڑا تھا۔ وزیر زادہ دوڑا آیا اور کہا "حو میاں' پروانے اٹھو' تمہاری شمع نے آکر محل کو روشن کردیا۔" شہزادہ حیران ہو گیا۔ جب وزیر زادے نے قسم کھا کر کہا ... تو اٹھ کر اس کی پیشانی چوم لی اور کلاہ جواہر نگار جس پر ہما کے پروں کی کلغی لگی تھی' تکیے پر سے اٹھا کر اس کے سر پر رکھ دی۔"

(قصص ہند)

"دیکھو جلسہ مشاعرے کا امرا شرفا سے آراستہ ہے۔ معقول معقول بڈھے اور جوان برابر لمبے لمبے جامے موٹی موٹی پگڑیاں باندھے بیٹھے ہیں۔ کوئی کٹاری باندھے ہے' کوئی سیف لگائے ہے۔ بعض وہ کہن سال ہیں جن کے بڑھاپے کو سفید داڑھی نے نورانی کیا ہے۔ بعض ایسے ہیں کہ عالم جوانی میں اتفاقاً داڑھی کو رخصت کیا تھا اب کیوں کر رکھیں کہ وضع داری کا قانون ٹوٹتا ہے۔ اس پر خوش مزاجی کا یہ عالم ہے کہ ان کے بڑھاپے کی زندہ دلی سے آج نوجوانوں کی جوانی پانی پانی ہوتی ہے۔"

"دفعتاً ہوا بند ہوئی۔ ابر سا گھر آیا۔ دنیا دھواں دار ہو گئی۔ پھر سفید غبار سا برستا ہوا معلوم ہوا۔ تھوڑی دیر میں دیکھا تو زمین پر' کوٹھوں پر' دیواروں پر اور منڈیروں پر کوئی سفید سفید آٹا سا چھڑک گیا۔ غرض کہ ایک جھکولا برف کا پڑا۔ رات گزری۔ صبح کو دیکھا تو تمام درختوں پر برگ ریز کا حکم پہنچ گیا۔ دوسرے دن ایک جھکولا اور ساتھ ہی ایک سناٹا ہوا کا آیا۔ پھر جو دیکھا تو درخت پر پتے کا نام نہیں۔"

تقرر دوبارہ ہو گیا اور وہ مسٹر پیٹرسن انسپکٹر تعلیمات کا ہاتھ بٹانے کے لیے کوہ مری روانہ ہو گیا۔

پیٹرسن کی قلمی رفاقت کے بعد آزاد کو سرکاری اخبار کا ایڈیٹر مقرر کر دیا گیا۔

یہ زمانہ اس کی سرکاری' ادبی اور تعلیمی تصانیف کا عہد کہلانے کا مستحق ہے۔ وہ سرکاری اخبار کی مصروفیات سے وقت نکال کر بچیوں کے لیے اردو ریڈریں تیار کرتا رہا لیکن ستم ظریفی یہ تھی کہ اس کی یہ محنت اس کے نام سے شائع نہیں ہوتی تھی بلکہ ان کتابوں پر پنجاب کے ناظمِ تعلیمات ہالرائڈ کا نام درج ہوتا تھا۔

اسی دور میں اس نے قصص ہند مرتب کی جو اس کے نام سے شائع ہوئی۔ فارسی قواعد بھی مرتب کی۔ حکومت کی طرف سے ہونے والے مقابلوں میں بھی حصہ لیتا رہا اور انعام کا مستحق ٹھہرتا رہا۔ ان تصنیفات نے اسے مقبول خاص و عام بنادیا۔

ادبی کاوشوں اور عارضی ملازمتوں کا یہ سلسلہ جاری تھا کہ گورنمنٹ کالج لاہور کی مسند عربی نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔

مولوی علم دار حسین جو کالج میں عربی کے پروفیسر تھے' بیماری کے سبب طویل رخصت پر چلے گئے۔ طلبہ کا حرج ہو رہا تھا لہٰذا ڈاکٹر لائٹنر کے توسط سے اس پوسٹ پر آزاد کا عارضی تقرر ہو گیا۔

اس نے جبّا پہنا اور ہمیشہ کی طرح ایک آستین میں ہاتھ ڈالا' ایک خالی لٹکتی رہی۔ گھوڑے پر سوار ہوا اور کالج پہنچ گیا۔ طلبہ کے لیے اس کا نام نیا نہیں تھا۔ جب انہوں نے اس کے پڑھانے کا انداز دیکھا تو اس کے گرویدہ ہو گئے۔ بات بات پر اشعار کا برمحل استعمال۔ لیکچر کے دوران میں ادبی لطیفوں کی بھرمار۔ بے تکلفی کا انداز' یہ طریقۂ کار کسی اور پروفیسر کا کیسے ہو سکتا تھا۔ تھوڑے دن میں یہ حال ہو گیا کہ اس کا گھوڑا پیچھے چل رہا تھا' وہ آگے ہے اور طلبہ اس کے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ کلاس سے باہر بھی ایک کلاس لگی ہوئی ہے۔

اس کی قسمت کہ مولوی علم دار کا انتقال ہو گیا اور طلبہ میں اس کی مقبولیت دیکھتے ہوئے اس کی نوکری عارضی سے مستقل ہو گئی۔

گورنمنٹ کالج سے وابستہ ہونے کے بعد اس کی زندگی کا بہترین دور شروع ہوا۔ عارضی ملازمتوں کی بے اطمینانی ختم ہو گئی' ہم چشموں میں وقار بڑھ گیا اور معاشی الجھنوں سے نجات مل گئی۔

ملازمت کے ساتھ ساتھ انجمن پنجاب کی طرف سے شائع ہونے والے اخبار "ہمائے پنجاب" کی ذمّے داریاں بھی اسی کو سنبھالنا پڑ رہی تھیں۔

وہ ان دونوں ذمّے داریوں کو نہایت خوبی سے انجام دے رہا تھا۔

۱۸۷۱ء میں ہمائے پنجاب میں' سیالکوٹ کے ایک نامہ نگار کا خط شائع ہوا جس میں اس نے لکھا تھا کہ ڈاک خانے کے ملازم لفافے میں کوئی قیمتی چیز اور نوٹ وغیرہ دیکھ کر اسے ایسی خوبی سے تراشتے ہیں کہ پتا تک نہیں چلتا۔

پوسٹ ماسٹر جنرل نے صدر انجمن سے باضابطہ طور پر شکایت کی اور آزاد کی جواب طلبی ہو گئی۔ صدر ڈاکٹر لائٹنر تھے اس لیے آزاد کو اطمینان تھا لیکن جب اسے یہ معلوم ہوا کہ اسے اخبار سے نکال دیا گیا ہے اور اس کی جگہ کسی اور کو ایڈیٹر بنا دیا گیا ہے تو اسے سخت صدمہ ہوا۔ اسی دوران میں انجمن کے کاغذات اور کتابیں وغیرہ جو اس کی تحویل میں تھیں واپس لے لی گئیں تو وہ نہایت دل برداشتہ ہوا۔

وہ کسی انگریز سے اور وہ ڈاکٹر لائٹنر سے لڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن اس کے دل میں ان کا یہ رویہ پھانس بن کر چبھنے لگا۔

اس کسک کو کبھی نہ کبھی تو اپنا رنگ دکھانا تھا۔ آخر اس کا وقت آگیا۔

ڈاکٹر لائٹنر نے تاریخ کے موضوع پر ایک کتاب "سنین اسلام" آزاد سے لکھوا کر اپنے نام سے شائع کی تھی۔

جب تک دوستی تھی' آزاد نے یہ بات گوارا کر لی تھی لیکن جب اس کتاب کا دوسرا حصہ لکھنے کا وقت آیا اور اس دوران میں یہ تلخ واقعات بھی پیش آگئے تو آزاد نے سابقہ تندہی سے کام نہیں لیا اور لائٹنر کو بار بار تقاضے کرنے پڑے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لائٹنر اس سے خفا ہو گئے اور دونوں دوستوں کے درمیان کشیدگی کی ایک گہری لکیر کھنچ گئی۔

محکمانہ میل جول اب بھی جاری تھا لیکن اب وہ اگلا سا التفات باقی نہ رہا۔

○☆○

لیفٹیننٹ گورنر بہت دن سے یہ بات محسوس کر رہے تھے کہ سرکاری مدارس میں اردو کی جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں' ان میں نظمیں بالکل نہیں ہیں۔ انہوں نے اس کمی کا ذکر ناظم تعلیمات مسٹر ہالرائڈ سے کیا لیکن ہالرائڈ کے جواب نے انہیں خاصا مایوس کیا۔

"جناب' اردو میں نظمیں لکھنے کا رواج ہی نہیں' غزلیں ہیں۔ ان کے مضامین اس قابل نہیں کہ بچوں کو پڑھائے جائیں۔"

"وہاٹ! یہاں کے شاعر نظمیں نہیں کہتے؟"

"نظموں کے نام پر قصیدے اور عاشقانہ مثنویاں لکھتے ہیں" ہالرائڈ نے کہا۔

"آپ انعام کا لالچ دیجئے۔ کچھ بھی کیجئے' بچوں کے لیے اس قسم کی نظمیں لکھوائیے جیسے کہ انگریزی میں ہوتی ہیں۔ اگر آپ کامیاب ہو گئے تو یہ ہم انگریزوں کا بڑا کارنامہ ہو گا۔ اس سے انگریزی تہذیب کی روح اردو میں سرایت کر جائے

گی۔" گورنر نے مشورہ دیا۔

اس وقت تو بات کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی لیکن اپنے افسر کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ہالرائڈ اس اسکیم پر برابر سوچتے رہے اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اس کام کے لیے باقاعدہ تحریک چلانے کی ضرورت پڑے گی۔ یہ تحریک کس طرح چلائی جائے؟ اس کا جواب ان کے پاس نہیں تھا۔ ان کی نگاہِ انتخاب محمد حسین آزاد پر پڑی۔ وہ محکمۂ تعلیم کا ذمّے دار فرد تھا۔ انجمن پنجاب کے جلسے اس کی گل افشانی گفتار سے گونج رہے تھے۔ اس کی ادبی شہرت سارے ملک میں پھیلی ہوئی تھی۔ ہالرائڈ نے اس کے تجربے سے فائدہ اٹھانے کا ارادہ کیا اور آزاد کے سامنے اپنا منصوبہ رکھا۔

ہالرائڈ کی خواہش تو صرف یہ تھی کہ نصاب کی کتابوں کے لیے نظمیں مل سکیں لیکن اس منصوبے سے واقف ہوتے ہی آزاد کی دوربیں نگاہوں نے ادبی افق پر ایک آفتاب تازہ کو دیکھ لیا۔ اس نے سوچا وہ اس تحریک سے فائدہ اٹھا کر اُردو شاعری کا رخ موڑ سکتا ہے اور اسے محدود موضوعات کے دائرے سے نکال کر لامتناہی وسعتیں عطا کر سکتا ہے۔

اس نے تجویز پیش کی کہ ایسے مشاعرے منعقد کیے جائیں جن میں مختلف موضوعات پر شعرا سے نظمیں پڑھوائی جائیں۔ چند مشاعروں کے بعد یہ نئی شاعری تحریک کی صورت اختیار کر جائے گی۔ پھر یہ مشاعرے لاہور تک محدود نہیں رہیں گے۔ ملک کے دوسرے حصوں میں خود بخود منعقد ہوا کریں گے۔

"کوئی اور صورت نہیں ہو سکتی؟" ہالرائڈ نے کہا۔

"ہندوستانی شعرا، مشاعروں کے عادی ہیں۔ یہ تبدیلی آئے گی تو صرف مشاعروں کے ذریعے آئے گی۔"

آزاد کی بات اتنی معقول تھی کہ ہالرائڈ کو قائل ہونا پڑا۔

۱۹ اپریل ۱۸۷۴ء کو شام چھ بجے انجمن پنجاب کے اشتراک سے ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں عوام کو ان مشاعروں سے باخبر کیا گیا۔ ابتدا میں آزاد نے ایک لیکچر دیا۔

"نئے انداز کے خلعت و زیور جو آج کے مناسب حال ہیں وہ انگریزی صندوقوں میں بند ہیں اور ہمارے پہلو میں دھرے ہیں اور ہمیں خبر نہیں۔"

"تمہاری شاعری چند محدود احاطوں میں بلکہ چند زنجیروں میں مقید ہو رہی ہے۔ اس کے آزاد کرانے میں کوشش کرو نہیں تو ایک زمانہ تمہاری اولاد ایسا پائے گی کہ ان کی زبان شاعری کی زبان سے بے نشان ہوگی۔"

نمونۂ کلام

قیدیانِ زلف پر کیا جانے شب کیونکر کٹی
آج زنداں سے نہیں آتی صدا فریاد کی
سرو ساں زنجیر الفت سے ہے پابندِ چمن
نام کو آزاد ہے حالت یہ ہے آزاد کی

چشم نرگس کو بھی گلشن میں بڑے ہیں دعوے
تم ذرا چل کے دکھا دو سرِ گلزار آنکھیں

اس کے بعد آزاد نے اپنی ایک مثنوی جو رات کی حالت پر تھی، پیش کی۔ اس مثنوی میں اس نے یہ جدت پیدا کی تھی کہ مثنوی کے لیے عام طور پر جو بحریں رائج تھیں، اس سے اختلاف کرتے ہوئے ایک نئی بحر میں تھی۔

عالم ہے اپنے بستر راحت پہ خواب میں
آزاد سرجھکائے خدا کی جناب میں
پھیلائے ہاتھ صورتِ امیدوار ہے
اور کرتا صدقِ دل سے دعا بار بار ہے
مجھ کو تو ملک سے ہے نہ ہے مال سے غرض
رکھتا نہیں زمانے کے جنجال سے غرض
یارب یہ التجا ہے کرم تو اگر کرے
وہ بات دے زباں پہ کہ دل پر اثر کرے

ہوتا وہ بعد شام شفق پر عیاں ترا
اڑتا وہ آبنوس کا تختِ رواں ترا
اے رات سنتا ہوں کہ ترے سر پہ تاج ہے
ہر گوہر اس میں ملکِ حبش کا خراج ہے
دنیا پہ سلطنت کا تری دیکھ کر حشم
کھاتا ہے دن بھی تاروں بھری رات کی قسم

یہ نظم اردو کی جدید شاعری کا نقطۂ آغاز تھا۔ اس میں کوئی بڑی تبدیلی تو نظر نہیں آتی تھی لیکن مخصوص بحر سے انحراف کر کے اس نے تقلید سے بغاوت کرنے کی طرف ایک اشارہ ضرور کر دیا تھا۔

ہرچند بقول ہالرائڈ یہ جلسہ اس لیے منعقد کیا تھا کہ نظم اردو جو چند عوارض کے باعث تنزل اور بدحالی میں پڑی ہے اس کی ترقی کا سامان بہم پہنچائے جائیں لیکن آزاد کے لیکچر کا

خاطرخواہ اثر نہ ہوا۔ اخبارات میں بھرپور مخالفت کی گئی۔ لاہور کے ایک اخبار "پنجابی" نے آزاد کی پوری تقریر کی مخالفت کی۔ اس کے علاوہ اخبار سررشتہ تعلیم اودھ میں منشی غلام حسین نے آزاد کے لیکچر پر تفصیلی تبصرہ کیا اور اس کی مخالفت کی۔

ان تبصروں سے اندازہ ہوتا تھا کہ آئندہ ہونے والوں کی پذیرائی نہیں ہوسکے گی۔ مخالفت کی آندھی بڑے زور شور سے چلے گی۔

اس اندیشے کے باوجود تیس جون ۱۸۷۴ء کو نظم اردو کا پہلا مشاعرہ منعقد ہوا۔ اس کا موضوع برسات تھا۔

بہت سے ممتاز افراد، عہدے داران و سرکاری ملازمین کالجوں اور مدارس کے اساتذہ اور طلبہ اور علم دوست حضرات نے اس مشاعرے میں شرکت کی۔

اس مشاعرے کو عام شعرا نے درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ صرف سات شعرا شریک ہوئے۔ ان میں بھی حالی اور آزاد ہی دو قابل ذکر شعرا تھے۔ آزاد نے اس مشاعرے میں اپنی نظم ابر کرم کے عنوان سے پیش کی۔ اس نظم بھی جزئیات نگاری عروج پر نظر آتی تھی۔ بیان میں جوش اور زبان سادہ تھی۔ صاف نظر آتا تھا کہ یہ اردو کی موجودہ شاعری سے کوئی مختلف چیز ہے۔

بوندوں میں جھومتی وہ درختوں کی ڈالیاں
اور سبز کیاریوں میں وہ پھولوں کی لالیاں
وہ ٹہنیوں میں پانی کے قطرے ڈھلک رہے
وہ کیاریاں بھری ہوئی تھالے چھلک رہے
آب رواں کا نالیوں میں لہر مارنا
اور روئے سبزہ زار کا دھوکر سنوارنا
گرنا وہ آبشار کی چادر کا زور سے
اور گونجنا وہ باغ کا پانی کے شور سے
جل تھل ہیں کوہ و دشت میں تالاب آب کے
گویا چھلک رہے ہیں کٹورے گلاب کے
کوئل کا دور دور درختوں پہ بولنا
اور دل میں اہل درد کے نشتر تھنگھولنا
جھولوں میں نوجواں ہیں پینگیں بڑھا رہے
اور بچے آم کے ہیں پپیے بجا رہے
ساون کے گیت اٹھا رہے ارماں دلوں میں ہیں
پردیسیوں کی یاد سے ارماں دلوں میں ہیں

اب تک اُردو شعرا منظر نگاری کے جو مرقعے کھینچتے تھے، ان میں ایران کا اثر صاف نظر آتا تھا۔ باغ کی منظر کشی ہوتی تھی لیکن صاف نظر آتا تھا کہ یہ باغ ایران میں واقع ہے، ہندوستان میں نہیں۔ آزاد کی اس نظم میں ہندوستان کی برسات نظر آتی تھی۔ زبان کی سادگی بھی ایک نئی چیز تھی۔

اس کوشش کی پذیرائی ہونی چاہیے تھی لیکن نئی چیز بڑی دیر میں قبول ہوتی ہے۔ کان جس چٹخارے سے آشنا ہوگئے تھے، اس کے سوا کچھ قبول کرنے کو تیار نہیں تھے۔ اخبارات نے اس مشاعرے میں پڑھی جانے والی نظموں کے خلاف محاذ بنالیا۔ آزاد پر خاص طور پر تنقید کی گئی کیونکہ وہی ان مشاعروں کا روح رواں تھا۔

مخالفتوں کے اس طوفان کے باوجود ایک کے بعد دوسرا مشاعرہ منعقد ہوتا رہا۔ مشاعروں کی گہما گہمی کے ساتھ ساتھ مخالفت کا زور بھی بڑھتا جارہا تھا۔

آزاد نے ان مخالفتوں کا ابھی تک کوئی جواب نہیں دیا تھا لیکن وہ دل برداشتہ ضرور تھا۔ اسے یہ فکر بھی دامن گیر تھی کہ کہیں مخالفت کا یہ طوفان اردو شاعری میں اصلاح و ترقی کی اس اولین کوشش کو بالکل ختم نہ کردے۔

اس نے اس صورت حال سے گھبرا کر سرسید احمد خاں کو خط لکھا کہ وہ اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے اپنے قلم سے اس کو سہارا دیں۔ سرسید کا جواب آیا۔

"میں مدت سے چاہتا تھا کہ ہمارے شعرا نیچر کے حالات کے بیان پر متوجہ ہوں۔ آپ کی مثنوی "خواب امن" پہنچی۔ بہت دل خوش ہوا۔ اب بھی اس میں خیالی باتیں بہت ہیں۔ اپنے کلام کو اور زیادہ نیچر کی طرف مائل کرو۔ لوگوں کے طعنوں سے مت ڈرو۔ بعد رمضان ایک مضمون طویل اس باب میں لکھوں گا۔"

سرسید نے اپنا وعدہ پورا کیا اور ایک طویل مضمون "علم انشا اور اردو نظم" لکھ کر تہذیب الاخلاق میں شائع کرایا۔

اس کے بعد بھی ہنگامے ختم نہیں ہوئے بلکہ مزید بڑھ گئے۔ ان ہنگاموں نے لکھنؤ کے ادبی معرکوں کی یاد تازہ کردی۔ خاص طور پر آزاد کو نشانۂ ستم بنایا گیا۔ اس سے بعض لوگوں نے یہ بھی اندازہ لگایا کہ آزاد کا کوئی حریف ہے جو اس موقع سے فائدہ اٹھا کر انہیں رسوا کر رہا ہے۔

مخالفتوں اور حوصلہ افزائیوں کا یہ ہنگامہ جاری تھا کہ یہ مشاعرے اچانک بند کردیے گئے۔

مشاعرے بند ہوگئے لیکن ان مشاعروں نے آزاد کو اردو شاعری میں ایک خاص مقام عطا کردیا۔ اس کی کوششوں سے اردو شاعری کو ایک نیا موڑ ملا نئی راہ کھلی۔ آزاد نے اپنا نام جدید

شاعری کے علم برداروں میں لکھوالیا۔

مخالفتوں کے باوجود ان مشاعروں کی بدولت پورے ملک میں تبدیلی کی لہر دوڑ گئی۔ دہلی اور میرٹھ میں اس انداز کے مشاعرے منعقد ہونے لگے اور اردو شاعری میں غزلوں کے ساتھ ساتھ نظمیں بھی جگہ پانے لگیں۔

مشاعروں کے ہنگامے سے نجات پانے کے بعد آزاد یک سوئی اور اطمینان کے ساتھ تصنیف و تالیف میں مشغول ہوگیا۔

آزاد نے جو مضامین انجمن پنجاب کے رسالے کے لیے لکھے تھے اور شائع ہوکر مقبول بھی ہوچکے تھے' اس نے ان مضامین کو جمع کیا۔ مزید مضامین لکھے اور انہیں ترتیب دے کر "آبِ حیات" اور "نیرنگِ خیال" کے عنوان سے کتابی صورت میں مرتب کرنا شروع کردیا۔

وہ ان کتابوں کو مرتب کرنے کی دشواریوں سے گزر رہا تھا کہ ایک مرتبہ پھر ڈاکٹر لائٹنر اس کے مقابل آگئے۔

آزاد نے ایک درخواست دی کہ اب کالج کے طالبہ کی تعداد میں اضافہ ہوگیا ہے اس لیے اس کی تنخواہ میں اضافہ کیا جائے اور دوسرے یہ کہ حسنِ خدمت کے صلے میں اسے کم از کم ایک ہزار ایکڑ زمین لاہور میں عطا کی جائے۔ اس کا ارادہ ایک موڈل فارم قائم کرنے کا ہے جس کے لیے زمین درکار ہے۔"

ڈاکٹر لائٹنر نے اس درخواست پر نہایت جارحانہ نوٹ لکھا۔ یہاں تک کہ اسے سازشی اور ناقابلِ اعتماد تک لکھ دیا اور یہ لکھا کہ اگر گورنمنٹ انہیں زمین کا عطیہ دے کر کالج سے علیٰحدہ کردے تو انہیں خوشی ہوگی۔

ماضی کا یہ دوست اس کا سب سے بڑا دشمن بن کر اس کے سامنے کھڑا تھا اور طرح طرح سے اس کی تضحیک کررہا تھا۔

اسی سال آزاد کے دو جگر گوشے وفات پاچکے تھے۔ وہ زخموں سے چور تھا کہ لائٹنر نے اس کے اعتماد کو پاش پاش کردیا۔

اس نے کیا تو یہ کیا کہ وہ خاموشی سے راولپنڈی پہنچا اور ناظم تعلیمات کو درخواست دی کہ وہ اب کالج کی ملازمت کرنا نہیں چاہتا۔ اسے ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر بنادیا جائے۔ اس کی خدمات محکمۂ تعلیم سے محکمہ انتظامی کو منتقل کردی جائیں۔

اس کی بدقسمتی لاہور سے اس کے ساتھ گئی تھی۔ اس نے درخواست پیش کی تھی کہ لائٹنر عارضی طور پر ناظمِ تعلیم مقرر ہوگئے۔

لائٹنر کے سامنے درخواست پہنچی اور آزاد کے پاس جواب صاف آگیا۔

"آپ کا نام حکومت کے پاس بھیجنا بے کار ہے کیونکہ حکومت پہلے ہی یہ فیصلہ کرچکی ہے کہ وہ افسر جو مدت دراز تک محکمۂ تعلیم سے وابستہ رہا ہے' اس کی سرکاری زندگی کے آخری حصے میں اسے عدلیہ سے منسلک کرنا بالکل بے کار ہے۔"

مرتا کیا نہ کرتا۔ وہ راولپنڈی سے واپس آگیا اور ایک مرتبہ پھر اسی تنخواہ پر گورنمنٹ کالج میں خدمات انجام دینے لگا۔

"آبِ حیات" کا کام بہت بکھر گیا تھا' اسے سمیٹنے کی کوشش کی۔ جن شعرا کے حالات جمع ہوچکے تھے' انہیں زبان و بیان کی مینا کاری سے سجا کر ایوانِ ادب میں پیش کردیا۔

"اے اہلِ وطن میں اس حال میں بھی تمہیں بھولا نہیں جو وقت نوکری کے کام سے خالی پاتا تھا' اس میں آرام نہ کرتا تھا۔ بہت کم سوتا تھا۔ اپنی معلومات کو اور جو اس سے خیال پیدا ہوتے تھے' لکھتا تھا اور پڑھتا جاتا تھا۔ اسی میں یہ اوراق پریشاں نکالے اور آبِ حیات کا جام بنا کر تمہاری خیانت طبع کے لیے حاضر کیا۔"

یہ کتاب یوں اہلِ نظر کے سامنے آئی جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے۔ ایسی نثر کسی نے اس سے پہلے نہیں پڑھی تھی۔ نثر میں شاعری کس نے کی ہوگی۔ تخیل کی بلند پروازی نظم کے ساتھ مخصوص تھی' اس نے نثر میں دکھادی۔ آزاد میں ڈرامائی قوت بلا کی تھی۔ اس قوت سے کام لے کر اس نے مردہ شعرا کو چلتے پھرتے ہوئے دکھادیا۔ جو زمانہ گزر گیا تھا' اسے آنکھوں کے سامنے لاکر کھڑا کردیا۔ تشبیہ اور استعاروں کا چمن کھلادیا۔ ایسی رنگین نثر لکھ دی کہ گھنٹوں پڑھیے' سر دھنیے۔ اس کے اس اسلوب کی کہیں اور مثال نہیں ملتی تھی۔

تعریفی تبصروں کے ساتھ ساتھ اس کے خلاف پھر ایک ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا۔ بعض شاعروں کا حال اس کتاب میں شامل نہ ہوسکا تھا' اس کے خلاف ایک ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا۔ مومن خان مومن جیسے شاعر کو اس نے نظرانداز کردیا تھا۔ اسے اس کی بدنیتی پر محمول کیا گیا اور شیعہ سنی کی بحثیں چھڑ گئیں۔

صادق الاخبار نے لکھا۔

"مومن تو نام پایا اور مذہب سنّی۔ ایسے کٹر اور ڈبل سنی کو کہ اصحاب ثلاثہ کرام کی تعریف و توصیف میں قصائد لکھے اور ایسے دل سے لکھے کہ مقبول بھی ہوگئے۔ مولوی آزاد کو کیا پڑی تھی کہ ایسے سنی مومن کا حال لکھ کر اور اس کو اس زمرہ استادان میں شمار کرکے آپ بھی اس کے پیرو ہوتے۔"

اخبارات کے ساتھ ساتھ اس کے پاس ان خطوں کے بھی ڈھیر لگ گئے جن میں ان کوتاہیوں کی طرف اشارے کیے

گئے تھے جو اس کتاب میں اس سے سرزد ہوئی تھیں۔

اس ہنگامے کے باوجود اس نے اپنی دوسری تصنیف "نیرنگِ خیال" پڑھنے والوں کے سامنے پیش کردی۔

آبِ حیات تو ایک تحقیقی کتاب تھی اس لیے بعض لوگوں کے نزدیک اس کا افسانوی طرزِ تحریر، تحقیق کی متانت کو مجروح کرتا تھا لیکن نیرنگ خیال تخیلاتی مضامین پر مشتمل تھی لہٰذا اس کی فکر نے خوب پرواز کی اور انشاء پردازی کے وہ جوہر دکھائے کہ اگر اس کے سوا کچھ اور نہ بھی لکھتا تو بھی صاحبِ طرز انشاپرداز کہلاتا۔

وہ اس تصنیف کی بدولت اردو میں تمثیلی مضامین کا موجد بن گیا۔ اس سے پہلے کسی نے اردو میں اس طرز کے مضامین نہیں لکھے تھے البتہ انگریزی میں ایڈیسن اور جانسن کے تمثیلی مضامین ملتے تھے۔ ان مضامین میں ایسے حواس اور جذبات کو جن کی کوئی شکل نہیں ہوتی، فرضی کرداروں کے ذریعے پیش کیا گیا تھا۔ یہ طرزِ ادا آزاد کی ڈرامائی قوت کے عین مطابق تھا لہٰذا وہ اس میں خوب کامیاب رہا۔

اس تصنیف سے نمٹ کر وہ "دربارِ اکبری" کو ترتیب دینے میں مصروف ہوگیا۔

وہ اس تصنیف کو سرسالار جنگ اول کے نام معنون کرکے حیدر آباد دکن میں ملازمت کا خواہش مند تھا۔ دکن میں قدردانی کا بازار گرم تھا اور وہ کالج کی سیاست سے تنگ آگیا تھا۔

ابھی کتاب مکمل نہیں ہوئی تھی۔ انتساب کا موقع نہیں آیا تھا کہ سرسالار جنگ وفات پاگئے۔

"مزہ تو اس کا جب تھا کہ خود لے کر جاتا اور بعض مقامات اس کے اپنی زبان سے پڑھتا اور دیکھتا کہ اس مقام پر وہ کیا فرماتے۔ ہائے سالار جنگ۔ سارے ارمان دل میں رہے، ہائے سالار جنگ!"

وہ سالار جنگ کے ماتم سے زیادہ اپنی قسمت کا ماتم کرکے، دل مسوس کر رہ گیا۔

سید حسن بلگرامی، عماد الملک سے خط و کتابت برابر جاری تھی لیکن اب وہ حیدر آباد جاکر کیا کرتا۔ کس توقع پر جاتا۔

آبِ حیات اور نیرنگِ خیال پنجاب یونیورسٹی نے اپنے کورس میں شامل کرلی تھیں۔ دوستوں نے مشورہ دیا کہ آبِ حیات پر جو اعتراضات تھے، انہیں دور کرکے امتحان سے قبل اگر اسے چھپوا لیا جائے تو بڑی تعداد میں فروخت ہوگی۔

مالی طمع نے اسے اکسایا اور وہ دوسرے ایڈیشن کی تیاری میں مصروف ہوگیا۔ اعتراضات اتنے تھے کہ انہیں دور کرتے کرتے اس کی آنکھیں جواب دینے لگیں۔ مومن کا تذکرہ شامل کیا۔ مفید اضافے کیے۔ نئے حالات تلاش کیے اور لکھے۔ ایسا ہوا کہ پوری کتاب دوبارہ لکھنی پڑگئی۔ دس مہینے کا کام اس نے ڈیڑھ ماہ میں مکمل کرکے دوسرا ایڈیشن شائع کرادیا۔

گھریلو الجھنیں اور تصنیفی صعوبتیں کیا کم تھیں کہ ایک اور خبر نے اس کے ہوش اڑادیئے۔ بہت دن سے یہ خبر افواہ بن کر گردش کررہی تھی کہ گورنمنٹ سررشتہ تعلیم کے بوجھ سے سبکدوش ہونا چاہتی ہے۔ پھر یہ خبر عام ہوگئی کہ گورنمنٹ کالج پنجاب یونیورسٹی کی تحویل میں چلا جائے گا۔

یہ افواہ حقیقت بن کر سامنے آگئی۔ یونیورسٹی نے اخراجات کم کرنے کے لیے یہ تجویز پیش کی کہ علوم و فنون، ریاضی وغیرہ کی تعلیم ترجموں کے ذریعے ہوجایا کرے گی صرف انگریزی کے لیے ایک پروفیسر کافی ہے۔

کالج کے یونیورسٹی کی تحویل میں چلے جانے کے بعد عملے کی تخفیف لازمی تھی۔ آزاد یہ سوچ رہا تھا کہ جس گھر میں ڈیڑھ سو روپے آتے ہوں، پچاس روپے کی پنشن میں کیسے گزارا ہوگا۔

گورنمنٹ کالج کے مولوی اور پنڈت تخفیف میں ضرور آئے لیکن حکومت نے اس سلسلے میں پنجاب یونیورسٹی سے درخواست کی کہ ان لوگوں کو اپنے یہاں جگہ دے۔

عمرِ عزیز کے پندرہ سال گورنمنٹ کالج کی نذر کرنے کے بعد وہ یونیورسٹی سے منسلک ہوا۔

تصنیف و تالیف کی محنتِ شاقہ نے اسے اعصابی طور پر کمزور کردیا تھا۔ مختلف بیماریوں نے اسے گھیر لیا تھا لیکن سب سے زیادہ تشویش ناک اس کی ذہنی غیر حاضری تھی۔ بیٹھے بیٹھے یوں گم ہوجاتا جیسے عالم بالا کی سیر کو نکلا ہوا ہے۔ ہوش میں آتا تو بہت دیر تک حیرانی اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی رہتی۔

وہ گورنمنٹ کالج سے کیا نکلا کہ مصیبتیں ایک ایک کرکے اس طرح ٹوٹنے لگیں جیسے سب اسی دن کے انتظار میں تھیں۔ مکان میں آگ لگ گئی جس میں ایک قدیمی ملازمہ جل کر مرگئی۔ یہ صدمہ بہت دن تک اس کی چھاتی کا داغ بنا رہا۔

یہ صدمے کیا کم تھے کہ ایک دن خبر آئی کہ اس کی پیاری بیٹی جس کو اس نے خود پڑھایا تھا، تصنیف و تالیف میں مدد کرتی تھی۔ بڑے ارمانوں سے اس کی شادی کی تھی، عین شباب میں انتقال کرگئی۔

وہ ایک دو نہیں، چودہ اولادیں زمین کے سپرد کرچکا تھا۔ اس کی چھاتی فولاد بن گئی تھی لیکن اس بیٹی کے انتقال نے اس کے دماغ کو بے قابو کردیا۔ یہ شبہ ہونے لگا تھا کہ اس کا دماغ چل گیا ہے۔ تصنیفات کا قلم دان الٹ گیا۔ لاہور بھر میں اس کی

دیوانگی کا چرچا ہو گیا لیکن یہ کیفیت عارضی تھی۔

یونیورسٹی کا یہ ایک سال اسی بے خودی میں گزر گیا۔ صحت یاب ہوتے ہی اسے ایران کی سیاحت کی سوجھی۔ اس ارادے کو بھی اس کی دیوانگی کا ہی شاخسانہ سمجھا گیا۔ اس کی اہلیہ، بیٹی کا صدمہ بھول کر اس فکر میں لگ گئی کہ وہ انہیں اس طویل سفر پر جانے سے کس طرح روکے۔ دوستوں نے اسے روکنا چاہا لیکن اب اس کی دماغی کیفیت شاید کچھ ایسی ہو گئی تھی کہ آگے کی طرف دیکھنے کے بجائے پیچھے کی طرف لوٹنا شروع ہو گیا تھا۔ ماضی کی ہر چیز اپنی طرف کھینچتی تھی۔ ایران اس کے اجداد کا ملک تھا۔ اسے دیکھنے کی تمنا نے اسے بے تاب کر دیا اور رخصت کے لیے درخواست دے دی۔

لائٹنر ان دنوں پنجاب یونیورسٹی کے رجسٹرار مقرر ہو گئے تھے۔ انہوں نے معاندانہ روش پر چلتے ہوئے یہ درخواست مسترد کر دی۔ آخر یہ معاملہ سر چارلس ایچی سن گورنر پنجاب تک پہنچا۔ وہ آزاد سے واقف تھے۔ انہوں نے رخصت کی درخواست منظور کر لی لیکن یہ رخصت اسے نیم اوسط تنخواہ پر ملی۔

رخصت منظور ہوتے ہی اس نے رختِ سفر باندھا اور ۲۳ ستمبر ۱۸۸۵ء کو ریل میں بیٹھ کر کراچی روانہ ہوا۔ اس کے ایک شاگرد مولوی عمرالدین سندھ مدرسۃ السلام کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ کراچی پہنچ کر آزاد نے ان کے گھر قیام کیا۔

کراچی پہنچ کر معلوم ہوا کہ جہاز کل ہی روانہ ہوا ہے اور اب ایک ہفتے تک انتظار کرنا ہوگا۔ مولوی عمرالدین اس کی ہر طرح سے دلداری کر رہے تھے اس لیے یہ انتظار اس کی طبع نازک پر گراں نہ گزرا۔ اس نے اس فرصت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان لوگوں سے ملاقاتیں کیں جن کا اثر رسوخ ایران میں تھا اور مختلف لوگوں کے نام تعارفی خط لیے۔

جمعہ دو اکتوبر کو وہ عربیبا نامی جہاز میں سوار ہوا۔ شام ساڑھے چار بجے کے قریب جہاز نے لنگر اٹھایا۔

اس نے سنا تھا کہ جہاز کے سفر میں چکر آتے ہیں اور جی متلاتا ہے۔ حفظِ ماتقدم کے طور پر اس نے لیموں، انار اور تربوز بھی اپنے ساتھ لے لیے تھے لیکن اسے اس قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔

چار اکتوبر کو یہ جہاز گوادر کے قریب سے گزرا، چھ اکتوبر کو بندر عباس پہنچا اور بحرین ہوتا ہوا دس اکتوبر کو "بو" شہر میں لنگر انداز ہوا۔ اس نے یہاں تک کا کرایہ صرف ۲۳ روپے ادا کیا۔

چھ دن تک بوشہر میں قیام کرنے کے بعد اس نے ایک ایرانی رہوار کرائے پر لیا اور شام کے وقت شہر سے نکل کر شیراز جانے والے ایک قافلے میں شامل ہو گیا۔

شب و روز مسلسل سفر کرنے کے بعد ۲۹ اکتوبر کو وہ شیراز پہنچا۔

شیراز دیکھنے کا ارمان تھا۔ ایک مدت کے بعد خدا نے یہ ارمان پورا کیا۔ خواجہ حافظ اور شیخ سعدی کا پیارا وطن جس پر وہ لوگ دعاؤں اور تعریفوں کے پھول چڑھائیں، اسے دیکھنے کا ارمان کیوں نہ ہو۔ اس نے دیکھا اور تعجب کے ساتھ دیکھا کیونکہ جس شیراز پر نورانی بزرگوں نے نور برسائے تھے، اس کی رونق و آبادی ان کے ساتھ ہی رحلت کر گئی تھی۔ اب بڑی بڑی وسیع اور بلند مسجدیں اور مدرسے گرے پڑے کھڑے تھے اور بنانے والوں کی ہمتوں پر دلائل پیش کر رہے تھے۔

موسم سرما کا خوف سامنے تھا لیکن شیراز کو جی بھر کے دیکھنے کے لیے یہاں قیام ضروری بھی تھا۔ ایک شخص مرزا علی اکبر سے قیام و طعام کا معاملہ طے ہوا۔ طے یہ ہوا تھا کہ وہ دونوں وقت کھانا کھلائے گا اور مصارف آزاد ادا کرے گا لیکن تین دن بعد آزاد کو اس سے پیچھا چھڑانا پڑ گیا۔ علی اکبر کے بوڑھے باپ نے یہ دیکھ کر کہ مہمان دونوں وقت گوشت پکواتا ہے، کھانے میں شریک ہونے لگا بلکہ اپنے نواسوں کو بھی بلا بلا کر بٹھانے لگا۔ آخر آزاد کو ایک اور جگہ اپنا انتظام کرنا پڑا۔ معلوم ہوا یہاں ایسے گھر بہت سے ہیں جہاں مہمانوں کو مقیم رکھا جاتا ہے۔

اس طرف سے اطمینان ہو جانے کے بعد اس نے شیراز کی سیر کرنی شروع کی۔ سب سے زیادہ اسے یہاں کے لوگوں کی وضع قطع نے متاثر کیا۔ یہ لوگ ابھی تک لباس کی تراش خراش میں اپنے بزرگوں کی تصویر تھے۔ علما اور ثقہ لوگ عمامہ باندھتے تھے۔ خاندانی ترک کلاہ پوست برہ کی پہنتے تھے۔

وہ ایک روز بازار سے گزر رہا تھا کہ مٹی کی چھوٹی چھوٹی ٹکیاں بکتی ہوئی دیکھیں۔ معلوم ہوا لوگ اس سے سر اور داڑھیاں دھوتے ہیں۔ اس مٹی میں خوشبو اٹھانے کی قدرتی تاثیر ہے لہٰذا اسے پھولوں میں بسا کر صاف کرتے ہیں اور ٹکیاں بنا کر بیچتے ہیں۔ گِل گُل (پھولوں کی مٹی) اس کا نام رکھا ہے۔ اسے بے اختیار شیخ سعدی کا یہ مصرع یاد آ گیا۔

گل خوشبوئے در حمام روزے

شہر کی عمارتوں اور حماموں کو اچھی طرح دیکھ لینے کے بعد اس نے یہاں کے مدرسوں کا رخ کیا۔ کہنہ مدرسوں میں نئی عمر کے لڑکے صرف، نحو، بلاغت، فقہ کی کتابیں سامنے رکھے کتاب کی مدد کے بغیر بحث میں مصروف تھے۔ اسے یہ دیکھ کر قدرے

تعجب ہوا کہ ہندوستان کی طرح طلبہ فقرہ بہ فقرہ سبق نہیں پڑھ رہے تھے بلکہ استاد کتاب کے اسباق کو تشریح کے ساتھ بیان کرتا جارہا تھا' طلبہ سنتے جاتے تھے۔ جس کے دامن میں جتنی وسعت تھی اتنا فیض اٹھا رہا تھا۔ یہی حال اس نے یہاں کے ہر مدرسے کا دیکھا۔

علم وادب کا ذوق یہاں کے امیروں کی زندگی میں بھی شامل تھا۔ اس کی ملاقات نواب مرزا علی خاں صدر سے ہوئی۔ باوجود پیرانہ سالی کے جب دیکھو' گرد کتابیں چنی ہیں۔ ایک دو ملا پاس بیٹھے ہیں۔ بیچ میں وہ خود بیٹھے ہیں۔ تصحیح کرتے ہیں حواشی لکھتے ہیں۔ ایک خوش نویس کتابوں کی تکمیل کررہا ہے۔ مصور نقاشی کررہا ہے۔ کھانے کا وقت ہوا وہیں پہلو میں دسترخوان بچھ گیا۔

نواب مرزا نے اسے اصرار کرکے دو دن اپنا مہمان رکھا۔

جس جس کو معلوم ہوتا جاتا تھا' اس سے ملاقات کے لیے آتا جاتا تھا۔ ہر ایک کا اصرار تھا کہ وہ اس کا مہمان بننا قبول کرے۔ حکیم مرزا حسن بھی ملاقات کو آئے۔ انہوں نے شیراز کی مفصل تاریخ لکھ کر "پارس نامہ" نام رکھا تھا۔

شام ہوگئی تھی۔ بوندیں پڑ رہی تھیں۔ انکار کے باوجود اصرار کرکے گھر لے گئے۔ رات بھر اپنی کتاب سناتے رہے۔ مطالب پر مشورہ کرتے رہے۔

شیرازیوں کی مہمان نوازی' زنجیر کی طرح پاؤں پکڑے ہوئی تھی لیکن اسے آگے جانا تھا۔

شیراز میں پندرہ دن قیام کرنے کے بعد اس نے رختِ سفر باندھا اور اصفہان وطہران کی طرف کوچ کیا۔

راستے میں چار چار پانچ پانچ کوس پر شاہ عباسی سرائیں موجود تھیں۔ ان میں ہر قسم کی سہولتیں مہیا تھیں۔ چار پانچ آنے کو مرغ اور پیسے کے دو انڈے' ہر قسم کے تروخشک میوے نہایت اعلیٰ اور نہایت ارزاں مل جاتے تھے۔

سفر طویل ضرور تھا لیکن آرام سے کٹ گیا۔ بارہ دن کے سفر کے بعد وہ اصفہان پہنچ گیا۔ شہر کیا تھا سلاطین صفویہ کی ہمتوں کا عجائب خانہ تھا۔

اس کثرت سے عمارتیں تھیں کہ دن بھر انہیں دیکھتا پھرتا تھا رات کو آکر بستر پر گر پڑتا تھا۔

اصفہان میں پانچ دن ٹھہرنے کے بعد وہ پھر روانہ ہوگیا اور کاشان پہنچا۔ یہاں وہ دم دروازے کی سرائے میں مقیم ہوا۔ کاشان سے قم پہنچا۔ یہاں امام علی ابن موسیٰ رضا کی ہمشیرہ کا مزار تھا۔ آزاد نے مزار پر حاضری دی۔ مختلف قبروں کے کتبے نقل کیے اور پھر اپنے سفر پر روانہ ہوکر طہران پہنچ گیا۔

اس سفر کی غایت' کتابوں کی تلاش تھی۔ اس نے یہاں پہنچتے ہی مطلب کے ٹھکانے تلاش کرنے شروع کردیے۔

وہ سب سے پہلے شہزادہ معتمد الدولہ نواب فرہاد مرزا سے ملا جن کا کتب خانہ پورے ایران میں لاثانی تھا۔

وہ اندرونِ خانہ تکیوں کے سہارے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے چاروں طرف کتابوں کی الماریاں تھیں۔ اسی خوش اخلاقی سے پیش آئے جو معزز ایرانیوں کا خاصہ ہے۔ ان کے چہرے مہرے اور آنکھوں سے بے پناہ قوت اور طاقت کا اظہار ہورہا تھا۔ بڑھاپا اور جسمانی معذوری بھی ان کی اس خصوصیت پر غالب نہ آسکی تھی۔ رخصت کے وقت اپنی ایک تصویر اور دو نسخے اپنی کتابوں کے دیے اور اصرار کیا کہ جب تک طہران میں ہو ملاقات کرتے رہو۔

شہزادے کی وساطت سے آزاد کو طہران کے دوسرے علما اور امرا سے بھی ملنے کا موقع ملا۔

لسانی تحقیق آزاد کا بڑا موضوع تھا۔ طہران میں اس واقفیت کے لیے بڑے مواقع تھے۔ وہ ان پارسیوں سے ملا جو قدیم فارسی بولتے تھے۔ آزاد نے جدید فارسی کا اس سے موازنہ کیا اور جدید وقدیم الفاظ کی ایک فہرست مرتب کی۔

مرزا رضا خان افشار سے بھی ملاقات کی۔ مرزا رضا خاں اس تحریک کے اولین علم بردار تھے جس کا مقصد ایران میں "پارسی خالص" کو رواج دینا تھا اور عربی الفاظ کو فارسی زبان سے خارج کرنا تھا۔ اصولی طور پر آزاد بھی اس کا حامی تھا۔

اس نے طہران کے شاعروں سے ملاقاتیں کیں۔ وہ ان کی شاعری سے کچھ زیادہ متاثر نہیں ہوا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ جس قدر تہذیب بڑھتی ہے' شاعری گھٹتی ہے۔

وہ تین مہینے تک طہران میں کتابیں اور معلومات جمع کرتا رہا۔ مضافاتی علاقوں میں جاکر الفاظ کی تحقیق کرتا رہا۔ سردیوں کا موسم گزر گیا اور جب آخری برف گر چکی تو اس نے مشہد مقدس کا رخ کیا۔

چھ منزلیں طے کرنے کے بعد آزاد سمنان پہنچا۔ یہاں پہنچ کر اسے خیال آیا کہ فارسی کے مشہور شاعر اور محقق مرزا یغما جندقی یہیں کے رہنے والے تھے چنانچہ اس نے ان کے خاندان اور اولاد کے بارے میں مقامی لوگوں سے دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ مرزا کا منجھلا اور چھوٹا بیٹا زندہ ہے۔

وہ انہیں ڈھونڈتا ہوا ان کی دکان پر پہنچ گیا۔ دیکھا کہ

دونوں بھائی دکان میں بیٹھے برنجی حقے اور چلمیں بنا رہے ہیں۔ ان کی حالت دیکھ کر سخت افسوس ہوا۔ شرفا والی کوئی بات بھی ان میں نہیں تھی۔ انہیں اس بات کی بھی کوئی خوشی نہیں تھی کہ ایک شخص ہندوستان سے ان کے باپ کو پوچھتا ہوا یہاں تک آیا ہے۔ اپنا کام کرتے رہے اور آزاد سے باتیں کرتے رہے۔

"مرزا مرحوم نے ایک کتاب فنِ لغت پر بھی لکھنی شروع کی تھی، وہ مکمل ہو سکی تھی یا نہیں؟" آزاد نے پوچھا۔

"ہمیں کیا معلوم۔ ویسے بھی وہ ہمارے بڑے بھائی کی تصنیف تھی۔ اب کہاں ہے ہمیں نہیں معلوم۔"

آزاد کو مزید افسوس ہوا کہ بڑے بھائی نے باپ کے مال پر ہاتھ صاف کیا اور تصنیف کو اپنے نام سے مشہور کر دیا۔

زمانے کی نیرنگیوں پر غور کرتا ہوا وہ آگے بڑھ گیا۔ سبزوار اور نیشاپور ہوتا ہوا مشہد کے قریب پہنچ گیا۔

ڈیڑھ فرسخ شہر رہا تو "قبہ مبارک" نمودار ہوا ایک دو ٹوٹے پھوٹے گھر اور ایک کارواں سرائے پختہ مگر شکستہ حال ملی۔ اس کا نام "طرق" تھا۔ سنا کرتا تھا کہ اس مقام سے زائرین پیادہ ہو جاتے ہیں۔ اس نے بھی سواری چھوڑی اور زمین کو بوسہ دیتا ہوا روضۂ اقدس تک پہنچا۔ دل حاضر تھا اور آنکھیں آنسو دے رہی تھیں۔

مشہد چونکہ تجارتی منڈی تھا۔ ترکستان، افغانستان اور ہندوستان وغیرہ سے تجارتی قافلے یہاں آتے تھے اس لیے کارواں سرائیں ہمیشہ آباد رہتی تھیں اور بازاروں میں ہر وقت رونق رہتی تھی۔ دو بازار نہایت طولانی اور وسعت میں نہایت دلکشا تھے۔ بیچ میں نہر جاری تھی اور دونوں طرف دکانیں اسباب سے مالا مال۔

مشہد مزاروں اور بازاروں کا شہر تھا۔ آزاد تاجر تو تھا نہیں کہ بازاروں سے دلچسپی ہوتی البتہ مشائخ اور بادشاہوں کے مزارات میں اس کی دلچسپی کے سامان تھے۔ نادر کی قبر دیکھ کر عبرت ہوئی۔ وہ نادر جس کی تلوار کی امان نہ تھی۔ جس کے گھوڑے کی جھپٹ سے لشکر پھوس کی طرح اڑتے تھے، وہ ایک چبوترے پر پڑا تھا۔

علما میں شیخ بہاؤالدین عاملی، شیخ حرعاملی، شیخ طبرسی مدفون تھے۔ شعرا میں فردوسی اور لسدی یہیں آسودہ خاک تھے۔ آزاد ان سب مزاروں پر گیا۔ فاتحہ پڑھی اور کتبوں کی نقلیں لیں۔

وہ یہاں بارہ دن مقیم رہا اور اب اسے ہندوستان واپس آنا تھا۔

مشہد سے ہندوستان آنے کے دو راستے تھے۔ پہلا راستہ کرمان ہوتا ہوا بندر عباس پہنچتا تھا لیکن یہ راستہ غیر آباد اور یگستانی تھا۔ آزاد نے دوسرا راستہ پسند کیا جو ہرات، قندھار ہوتا ہوا کوئٹہ پہنچتا تھا۔

یہ سفر اس کے لیے نہایت صبر آزما ثابت ہوا۔ خیر آباد کی منزل سے روانہ ہوا تو رات ہو چکی تھی۔ وہ اونٹ پر سوار تھا۔ نیند نے غلبہ کیا اور وہ اونگھنے لگا۔ کسی مقام پر اونٹ اس بری طرح اچھلا کہ آزاد نیند کی حالت میں اونٹ سے نیچے گر گیا۔ سر اور گدی کے بل گرا تھا۔ مرنے میں کچھ باقی نہ تھا کہ مگر خدا کی قدرت کہ سر بال بال بچا۔ زیادہ تر پشت، دونوں پہلو اور سینے پر صدمہ پہنچا لیکن وہی مثل ہے مرغی کو نکلے کا گھاؤ بہت۔ وہ مسلسل بیماریوں، ذہنی ریاضت اور سفر کی صعوبت سے اتنا کمزور ہو چکا تھا کہ اس نئی افتاد نے اس کی جان کے لالے ڈال دیے۔ شکر ہے شتربان کی نظر بچ گئی۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ کسی کو خبر ہی نہ ہوتی اور قافلہ آگے بڑھ جاتا۔ زمین سخت تھی اور وہ اونٹ کی بلندی سے گرا تھا۔ گر کر اٹھنے کی سکت بھی نہ ہو سکی۔ قافلے والوں نے اسے اٹھا کر اونٹ پر ڈال دیا اور اوپر سے لحاف ڈال کر رسی سے کس دیا۔ سب کا خیال تھا کہ مر کر رہ جائے گا۔ کہیں جا کر دفن کر دیں گے۔

منزل پر پہنچ کر شتربان نے آواز دی۔ آزاد نے آنکھیں کھولیں۔

"تو کیستی" (تو کون ہے؟)

شتربان نے نام لیا۔ گود میں لے کر اتارا اور بستر پر رکھ دیا۔ تین دن تک عجیب حال رہا۔ کھانستا بھی دکھ دیتا تھا۔ آخر آہستہ آہستہ اس نے جان پکڑی۔

○☆○

ہرات کے راستے میں آزاد جام سے گزرا۔ جام کا نام آتے ہی اسے مولانا جامی یاد آ گئے۔ اس کے علاوہ شیخ زندہ پیلؒ کی قبر مبارک کی وجہ سے یہ مقام اہمیت رکھتا تھا۔

اس نے شیخ زندہ پیلؒ کے مزار پر حاضری دی۔ یہ دیکھ کر اسے فخر آمیز خوشی ہوئی کہ میر محمد معصوم بھکری نے اس مزار کو از سرِ نو تعمیر کروایا تھا۔ میر معصوم امرائے اکبر شاہی میں شامل تھے۔ دربار اکبری لکھتے ہوئے آزاد اس نام سے واقف ہو چکا تھا اور اب اس دیارِ غیر میں یہ نام اس نے مزار کے کتبے پر منقوش دیکھا۔

وہ ہرات میں داخل ہوا تو یہ سوچ کر دل کا کنول کھل گیا کہ وہ ایک ایسے تاریخی شہر میں ہے جسے شاہان گزشتہ کا عیش باغ کہا جاتا تھا لیکن دیکھنے کے بعد بجھ گیا۔ اب یہ شہر ویران

ہو چکا تھا۔

ہرات پہنچتے ہی نائب کوتوال اس کے پاس آیا اور اسے سپہ سالار کے پاس لے گیا۔ مطلب یہ تھا کہ آزاد اسے پروانۂ راہ داری دکھائے۔

آزاد نے آتے ہی کارواں کی تلاش شروع کر دی تھی تاکہ آگے بڑھے۔ ایک قافلہ باشی سے گفتگو بھی ہوئی۔ اس نے کہا پرسوں روانہ ہو جائیں گے۔ آزاد مطمئن ہو کر جلدی جلدی شہر کو دیکھنے لگا۔ شہر کیا دیکھتا' یہاں کے لوگوں نے اس کا جینا دوبھر کر دیا۔ یہاں کے لوگ عجیب تھے جس طرف سے نکلتا' لوگ طرح طرح کے سوال کر کے اسے دق کرتے۔ کہاں سے آئے ہو؟ کیوں آئے ہو؟ کس راستے سے آئے ہو؟ اتنی کتابیں کیوں لائے ہو؟ ان کا کیا کرو گے؟ اللہ کی پناہ! آزاد کا ان سوالوں سے بُرا حال تھا۔

سوال پوچھتے تو کوئی بات نہیں تھی۔ ان سوالوں کے پیچھے ان کا شک چھپا ہوا تھا۔ اسے رہ رہ کر ملک ایران یاد آتا تھا۔ وہ وہاں مہینوں رہا۔ کسی نے اس پر شک نہیں کیا۔

وہ یہاں سے فوراً نکل جانا چاہتا تھا لیکن روانگی مسلسل ٹلتی جا رہی تھی۔ اس جبری قیام سے تنگ آ کر اس نے تاریخی عمارتوں کا رخ کیا۔

یہاں شاہان سلف' جلیل القدر نامی مصنف اور شعرا بھی موجود تھے۔ امام فخرالدین رازی بھی یہیں آسودہ خاک تھے۔ ملا محمد حسین کاشفی اور مولانا جامی بھی یہیں ابدی نیند سو رہے تھے۔ مولانا جامی کی قبر کو جا کر دیکھا۔ احاطہ ٹوٹا پھوٹا پڑا تھا۔ کسی زمانے میں تعویذ قبر اور قبر پر سنگ مرمر کی سلوں پر بہت دعائیں اور غزلیں عمدہ خط میں منقش ہوں گی۔ اب بس ایک ڈھیر پتھروں کا تھا۔ کسی شعر کا کوئی مصرعہ پڑھ لیا جاتا تھا باقی اللہ اللہ۔

مساجد میں گوہر شاد بیگم کی بنوائی ہوئی مسجد قابلِ تعریف تھی۔ اس نے کئی دن وہاں گزارے۔ جو فرمان اس پر کندہ تھے' انہیں بہ غور پڑھا اور اپنے پاس اتار لیا لیکن جو فرمان مسجد کے اندر تھے انہیں وہ نہیں پڑھ سکا۔ پہاڑی ملا مسجد کے اندرونوں میں حجرے بنا کر رہتے تھے اور اکثر موجود ہوتے تھے۔ ان کے ڈر کے مارے اس نے ان فرمانوں کو غور سے دیکھا تک نہیں کہ ابھی کوئی آ کھڑا ہوا اور چھرا مار دے تو کیسی خرابی ہو۔ جو اس کی ہر حرکت کو شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے ان سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔

قافلہ باشی نے پرسوں کہا تھا اور ٹلتے ٹلتے اٹھائیس دن گزر گئے۔

ہرات سے قندھار تک کا سفر بارہ چودہ منزلوں کا تھا۔ خیال تھا کہ جلدی طے ہو جائے گا لیکن دیر ہوتی گئی۔

اس نے بہت سی روٹیاں ساتھ لے لی تھیں۔ پانچویں دن وہ سڑ گئیں۔ انہیں بڑی مشکل سے سکھایا کہ پانی میں بھگو کر حلق سے اتار لوں گا۔ ایک جگہ گدھا پانی میں بیٹھ گیا اور سب روٹیاں' خمیر آٹا بن گئیں۔ دوسرے لوگوں کے پاس کھانے پکانے کا سب سامان موجود تھا لیکن وہ لوگ آزاد کو کسی چیز کو ہاتھ بھی نہیں لگانے دیتے تھے کہ ناپاک ہو جائیں گے۔ وہ ہندوستان کا تھا اس لیے ان کے نزدیک کافر تھا۔

مورچا خاک میں منزل ہوئی۔ عجیب ویران اور بے برکت گاؤں تھا۔

آزاد نے قافلے میں شریک ایک حاجی کو ساتھ لیا اور گاؤں میں گیا کہ کچھ کھانے کو لائیں۔ جس سے پوچھا' نان ہے؟ اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔ انہیں بھی ضد آ گئی تھی۔ ایک ایک دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ کہے روٹی ہے۔ اندر سے جواب آتا نہیں ہے۔

"کوئی مرغ مل جائے گا۔"

"نہیں۔"

"انڈا ہے؟"

"نہیں۔"

مہمان نوازی ان لوگوں میں تل کے دانے کے برابر نہیں ملتی تھی۔ شاید متعصب تھے کہ دوسری قوم والے کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

پورا گاؤں چھان مارا' صرف چند روٹیوں کے لیے۔ آخر ایک شخص کو کچھ لالچ آیا اور اس نے ڈیوڑھی قیمت وصول کر کے چار خشک روٹیاں ہاتھ میں تھما دیں۔ وہ انہی روٹیوں کو پانی میں بھگو بھگو کر حلق سے اتارتا ہوا اگلی منزل پر پہنچ گیا۔

اسی طرح روٹیاں مانگتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ کہیں موقع ملتا تو روٹیاں پکوا لیتا۔ آخر یہ تکلیف دہ سفر چھبیس دن بعد قندھار پہنچ کر ختم ہوا۔

قندھار میں بھی وہی قباحتیں دیکھیں جن سے وہ ہرات میں دوچار ہو چکا تھا۔ جس طرف سے گزرتا' سوالوں کی بوچھار ہو جاتی۔ افغانیوں کی بے مروتی اور کج خلقی اس کے دل پر نقش ہو کر رہ گئی۔ اس پر مستزاد یہ کہ بارش اور سخت سردی نے اس کے پاؤں سُن کر دیے۔

قندھار میں پانچ دن گزارنے کے بعد وہ کوئٹہ پہنچا اور اطمینان کی سانس لی۔

کوئٹہ میں اس نے ایک چھکڑا کرائے پر لیا۔ اس میں

کتابیں لادیں اور خود بچھونا بچھا کر اوپر لیٹ گیا۔ دو دن اور ایک رات سفر کرنے کے بعد وہ رندلی پہنچا اور وہاں سے ریل میں سوار ہو کر لاہور پہنچا۔

یہ بوڑھا مسافر جب ایران سے واپس آیا تو نادر کتابوں کا ذخیرہ اور فارسی محاوروں کا پشتارا اس کے ہمراہ تھا۔ یہ سفر اس نے اختیار بھی اسی لیے کیا تھا کہ بعض فارسی کتابوں کی تکمیل' ایران جائے بغیر نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ مقصد اس کا پورا ہو گیا۔ اگر وہ ایران نہ گیا ہوتا تو "سخن دانِ فارس" اور "نگارستان فارس" وجود میں نہ آتیں اور دربارِ اکبری کی عبارات اتنی مرصع نہ ہوتیں جتنی وہ بعد میں ہوئیں۔

ایران سے واپسی میں کتابوں کا جو ذخیرہ وہ اپنے ساتھ لایا تھا' اس کی موجودگی میں اس خیال نے سر ابھارا کہ اگر زمین حاصل ہو جائے تو وہ ایک شاندار کتب خانہ تعمیر کرے۔ ایران جانے سے پہلے بھی وہ زمین کے حصول کے لیے درخواست دے چکا تھا لیکن ڈاکٹر لائٹنر کی وجہ سے اس کی مخالفت ہوئی تھی۔ اب وہ گورنمنٹ کالج کا ملازم بھی نہیں رہا تھا اور لائٹنر بھی رخصت ہو چکے تھے لہٰذا اس نے ایک مرتبہ پھر محکمۂ تعلیم کے توسط سے درخواست پیش کی۔ محکمہ تعلیم نے یہ درخواست فنانس کمشنر کو روانہ کر دی۔ خط و کتابت جاری رہی اور بالآخر فنانس کمشنر نے صاف انکار کر دیا۔ اس نے گورنر کو لکھا۔ وہاں سے بھی انکار ہو گیا۔

اس نے مایوس ہونا سیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ برابر دفتروں کے چکر کاٹتا رہا اور بالآخر حکومت نے اعانت کی۔ درگاہ شاہ محمد غوثؒ کے پہلو میں زمین کا ایک قطعہ اسے اس مقصد کے لیے عطا ہو گیا۔

یہ منظر دیکھنے کا تھا۔ زمین ملتے ہی اس نے کتب خانے کی عمارت کا کام شروع کرا دیا۔ جس انداز سے وہ تعمیر کی نگرانی کر رہا تھا' کوئی دیوانہ ہی کر سکتا تھا۔ جتنی دیر مزدور کام کرتے رہتے' وہ بھی کھڑا رہتا۔ ایک ایک اینٹ کو آنکھوں آنکھوں میں چومتا رہتا۔

ایک مرتبہ بادل گھر کر آ گئے۔ بادلوں کے لشکر پانی برسانے کو تیار کھڑے تھے اور وہ پریشان ہو رہا تھا کہ اگر بارش ہو گئی تو تعمیر کا کام متاثر ہو گا۔ ایک دن کا بھی نقصان کیوں ہو۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر بہ آوازِ بلند دعا مانگنی شروع کر دی "یا اللہ! بارش نہ ہو۔ اگر بارش ہو گئی تو تعمیر کا کام بند ہو جائے گا" بجلی بڑے زور سے گرجی۔ آزاد کو طرارہ آ گیا۔ اس نے بادلوں کی طرف منہ کر کے ہاتھ سے اس طرح اشارے کیے جیسے کوئی کبوتر اڑاتا ہے۔

"بادلو' اڑ جاؤ۔ کہیں اور جا کر برسو۔ آزاد کے کام میں کیوں خلل ڈالتے ہو۔"

مزدور اس کی حالت دیکھ کر یہی سمجھے ہوں گے کہ اس کا دماغ چل گیا ہے۔

وہ مسلسل اشارے کر رہا تھا اور بادلوں کو ڈانٹ رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بادل چھٹ گئے۔ اس کا جذبہ کام آیا اور خدا نے اس کی سن لی۔

اسی دوران میں اسے ملکہ وکٹوریہ کے پنجاہ سالہ جشن کے موقع پر شمس العلما کا خطاب عطا ہوا۔ وہ اپنے معاصرین میں پہلا شخص تھا جسے اس خطاب سے نوازا گیا۔

اسی سال وہ اپنے بیٹے آغا محمد ابراہیم کی شادی کے فرض سے سبک دوش ہوا۔

انہی مصروفیات میں کتب خانے کی تعمیر کی دیکھ بھال بھی شامل تھی اور نوکری کے بکھیڑے بھی لیکن اس کے باوجود وہ تصنیف و تالیف کی طرف سے غافل نہیں ہوا۔

دری بچھی ہوئی ہے۔ سردیاں ہیں تو اس پر ایک پتلا سا گدیلا۔ پیچھے گاؤ تکیہ۔ سامنے لیمپ' پہلو میں کشمیری قلم دان' اس کے برابر تھال۔ اس میں مختلف طرح کے قلم اور مختلف رنگوں کی دواتیں۔ اسی میں ایک طرف کئی ہوئی چھالیا کہ جب جی چاہا چند دانے اٹھا کر منہ میں ڈال لیے۔ نصف شب کو لکھنے بیٹھتا اور صبح تک مسلسل قلم چلتا رہتا۔

اسی عالم میں اس نے "سخن دانِ فارس" پر نظرِ ثانی کی اور جو معلومات ایران سے جمع کر کے لایا تھا' اس نسخے کے سپرد کر دیں۔ دوسری کتاب "نگارستان فارس" بھی اسی سیر ایران کا عطیہ تھی جس میں اس نے ایرانی شعرا کا احوال رقم کیا تھا۔

اس کام سے نمٹنے کے بعد اس نے چاہا کہ اب "دربارِ اکبری" کو سنبھالوں مگر مروت و حمیت نے اجازت نہ دی۔ اپنے استاد ذوق کی بے ترتیب غزلیں جو وہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے بچا کر لے آیا تھا اب تک یونہی بے ترتیب پڑی تھیں۔ اس نے سوچا وہ کب تک انہیں کلیجے سے لگائے زندہ رہے گا۔ اگر وہ نہ رہا تو استاد کا نام بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مٹی میں دفن ہو جائے گا۔ دوست اس سے تقاضے کرتے رہے کہ وہ سب کام چھوڑ کر دربارِ اکبری کو مکمل کرے کہ اس تصنیف سے اس کا نام زندہ رہے گا لیکن اسے اپنے نام سے زیادہ استاد کے نام کی فکر تھی۔ وہ سب کام چھوڑ کر ذوق کا دیوان مرتب کرنے بیٹھ گیا۔

یہ کسی اور کا نہیں اس کے استاد کا دیوان تھا۔ اسے وہ

معمولی طریقے سے ترتیب دینا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے یہ انفرادیت پیدا کی کہ جن غزلوں اور قصیدوں سے کوئی خاص واقعہ منسلک تھا' اسے بھی حاشیے میں درج کردیا جس سے ذوق کے زمانے کی دلی چلتی پھرتی نظر آتی تھی۔

دیوانِ ذوق کی تکمیل کے سلسلے میں اس نے اپنی بیاضوں' ذوق کے مسودوں کے ساتھ ساتھ ذوق کے شاگردوں سے بھی معلومات جمع کیں۔

قلم کا مسافر زمین سے آسمان اور مکان سے لامکان تک بارہا اترتا چڑھتا رہا۔ دس مہینے بعد آکر قلمدان میں دم لیا۔

دس مہینے کی محنت شاقہ کے بعد ایک ایسا دیوان وجود میں آگیا جس نے ذوق کے نام کو ہمیشہ کے لیے زندہ کردیا۔

ذوق کے نام کا چراغ جل گیا لیکن وہ خود بجھنے لگا۔ اس دیوان کو مرتب کرتے ہوئے اس نے اپنی ہمت سے بڑھ کر محنت کی تھی۔ اتنا جاگا کہ سونے کی عادت ہی ختم ہوگئی۔ رات رات بھر ٹہلتا تھا مگر نیند نہ آتی تھی۔ مسلسل بے خوابی نے اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ مسلسل حوادث اور لگاتار محنت نے اس کے اعصاب کو پہلے ہی کمزور کردیا تھا' یہ دیوان ایک بہانہ بن گیا۔ مزاج میں ایسا چڑچڑا پن پیدا ہوگیا جو دوسروں کے لیے ناقابلِ برداشت ہوگیا۔ جب غصہ حد سے زیادہ بڑھ گیا تو گھر والوں نے ڈر کے مارے بات کرنی چھوڑ دی۔ ایک کونے میں چپکا بیٹھا رہتا۔ کسی نے کھانے کو دے دیا' کھالیا۔ رات ہوتی تو لیٹے بیٹھ گیا لیکن کسی کو نہیں معلوم تھا کہ وہ کیا لکھ رہا ہے۔ اپنے مسودوں کو کسی خزانے کی طرح چھپاتا تھا۔

یہ کیفیت ایک قسم کے مراق میں تبدیل ہوگئی۔ ہر ایک کی طرف سے دل میں شک آنے لگا۔ بھوز ہر دے دے گی' بیٹا کل روپے پر قابض ہوجائے گا۔ یہ لوگ میرے مسودے چراکر بیچ آئیں گے۔ ہوا خوری کے لیے باہر نکلتا تو بادلوں سے' چڑیوں سے' بچوں سے' پیڑوں سے' کبھی اپنے آپ سے باتیں کرتا ہوا چلتا۔ لوگ دیکھتے تو ہنستے کہ میاں آزاد کا دماغ چل گیا ہے۔

یہ مراق اتنا شدید ہوگیا کہ وہ کتب خانہ جو بڑے شوق سے پبلک کے فائدے کے لیے بنوایا تھا' بند کردیا کیونکہ اب وہ وہاں کسی کو قدم بھی رکھنے نہیں دیتے تھے کہ آنے والے میری کتابیں چراکر لے جائیں گے۔ حکومت کی طرف سے نوٹس آیا کہ کتب خانہ کھولا جائے لیکن یہاں تو حالات ہی دوسرے تھے۔ اس کے بیٹے نے تمام حالات لکھ کر حکومت کو بھیج دیے۔ حکومت نے پھر نوٹس بھیجا کہ کتب خانہ خالی کردیا جائے۔ تعمیر پر جو رقم خرچ ہوئی ہے وہ میونسپل کمیٹی ادا کردے گی لہٰذا کتب خانہ وہاں سے منتقل کردیا گیا۔ دیوانگی کے ہاتھوں برسوں کی محنت منٹوں میں برباد ہوگئی۔

یہ دیوانگی عجیب قسم کی تھی۔ پانچ منٹ' دس منٹ... بعض اوقات آدھا پونا گھنٹا اچھی طرح باتیں کرتا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ دماغ پر کوئی اثر نہیں۔ حافظہ اور دل اچھا ہے۔ یکایک دیوانگی شروع ہوجاتی۔ سامنے والا حیران رہ جاتا۔ اسے اس وقت ہوش آتا جب آزاد اسے پہچاننے سے انکار کرتا یا گالیوں سے نوازتا۔

اس کی بیوی اس کی حالت دیکھتی تھی اور روتی تھی۔ بیٹا الگ پریشان تھا۔ علاج کرانے یا دوا کھانے پر وہ تیار نہیں ہوتا تھا۔ آخر یہ طے ہوا کہ دہی کا بہت شوق ہے' دہی میں دوا ملاکر کھلادی جایا کرے۔ خدا جانے اسے کیسے معلوم ہوگیا کہ دہی کھانا ہی چھوڑ دیا۔ پھر بھی کسی نہ کسی طرح دوا کھلادی جاتی تھی لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔

مولوی خلیل الرحمٰن اس کے ایک دوست اس سے ملنے آئے۔

صحن میں دو چارپائیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ایک پر آزاد بیٹھے تھے۔ مولوی صاحب ازراہِ ادب پائنتی بیٹھ گئے۔

"میاں کس لیے وہاں بیٹھے ہو' آرام سے سرہانے بیٹھو۔"

"اچھا بیٹھا ہوں۔ بس آپ کی خیریت لینے آگیا تھا۔"

"میں خیریت سے ہوں مگر تم ٹھیک طرح بیٹھ جاؤ۔"

"ٹھیک بیٹھا ہوں۔ اور سنائیے۔"

"کیا ٹھیک ٹھیک کی رٹ لگا رکھی ہے۔ میری پائنتی ٹوٹی جاتی ہے اور تو کہتا ہے ٹھیک بیٹھا ہوں۔"

مولانا نے یہ رنگ دیکھا تو جھٹ سرہانے کی طرف بیٹھ گئے۔

اچھی خاصی باتیں ہو رہی تھیں۔ یہ معلوم بھی نہیں ہوتا تھا کہ اس کے دماغ پر کچھ اثر ہے۔

اسی وقت چوڑھی آئی اور صحن میں جھاڑو دینے لگی۔ بس پھر کیا تھا۔ آزاد نے بلند آواز میں چیخنا شروع کردیا۔ اپنی بیوی کو آواز دی۔

"ابرو کی ماں! تم سے کتنی دفعہ کہا ہے کہ چوڑھی کے آنے سے پہلے یہ چھڑکاؤ کرادیا کرو۔"

"بہشتی نہیں آیا تھا اس لیے چھڑکاؤ نہیں ہوسکا۔ تم چوڑھی سے کہو' جھاڑو نہ دے۔"

اس کا جو جواب آزاد نے دیا اسے سن کر مولوی خلیل الرحمٰن کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

آزاد نے نہایت بلند آواز میں فرمایا "اگر بہشتی نہیں آیا تھا تو تم ہی نے ذرا کھڑے ہو کے موت دیا ہوتا کہ گرد تو بیٹھ جاتی۔"

بوڑھی اہلیہ پر اس جواب سے کیا گزر گئی ہوگی۔ یہ گھر کے اندر کا سناٹا بول رہا تھا۔

مولوی خلیل وہاں سے نکلے تو انہیں یہ طے کرنے میں دیر نہیں لگی کہ مولانا آزاد اگر اب نہیں تو آئندہ بالکل دیوانے ہو جائیں گے۔ آزاد جیسا مہذب آدمی ایسے الفاظ زبان سے نکالے۔ یہ دماغ کی خرابی نہیں تو اور کیا ہے؟

انہی دنوں لاہور میں ایک فقیر سید دھیان شاہ چشتی تشریف لائے اور نویں کوٹ میں قیام کیا۔ یہ درویش کبھی سالک تھے کبھی مجذوب۔ کبھی ہوش میں ہوتے تو اچھی خاصی باتیں کرتے۔ آنے جانے والوں سے صاحب سلامت بھی کر لیتے لیکن بعض اوقات آپے سے باہر ہو جاتے۔

آزاد کو عملیات اور روحانیات سے ابتدا ہی سے دلچسپی تھی۔ مختلف وظیفے پڑھتے اور چلے کھینچتے رہتے تھے۔ اس فقیر کا احوال سنا تو اس سے ملنے چلے گئے۔ سید صاحب اس شفقت سے ملے جیسے اسی سے ملنے لاہور آئے ہوں۔

دیوانے کو دیوانہ مل گیا۔ کچھ دن نہیں گزرے کہ رازو نیاز کی محفلیں گرم ہونے لگیں۔ اب وہ کالج سے نکلتا اور سیدھا نویں کوٹ اس فقیر سے ملنے پہنچ جاتا۔ اپنے تمام علم و فضل کے باوجود وہ اس فقیر کا اسیر ہو کر رہ گیا تھا۔ لوگ حسرت سے اسے اس فقیر کے پاس بیٹھا دیکھتے اور آگے بڑھ جاتے۔

اس کا نتیجہ یہی ہونا تھا کہ اس کی ذہنی حالت مزید خراب ہونے لگی۔ اب اسے آسمانوں سے آوازیں آتی تھیں اور وہ ان آوازوں کا جواب دیتا تھا۔

ایک روز جو اس کا بیٹا آغا ابراہیم گھر آیا تو عجیب تماشا دیکھا۔ آزاد اپنے کمرے میں اکیلا کھڑا تھا لیکن اس طرح جھک جھک کر آداب کر رہا ہے جیسے کوئی سامنے ہے۔

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں، کس کو سلام ہو رہا ہے؟"

"ہش!" آزاد نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا "حضرت، بس کیا عرض کروں، اپنی حالت دیکھ کر آپ ہی کا ایک شعر یاد آتا ہے۔

زمانے نے رکھا مجھے متصل
پراگندہ روزی پراگندہ دل

"آپ سنائیے۔ عالم بالا میں کیسی گزر رہی ہے؟" وہ کسی سے مخاطب تھے اور ابراہیم افسوس کے ساتھ ان کی اس حالت کو دیکھ رہا تھا۔

جب وہ ہوش میں آ چکے اور یہ معلوم ہوا کہ جس سے وہ باتیں کر رہے تھے، وہ رخصت ہو چکا تو ابراہیم نے پوچھا۔

"آپ کس سے باتیں کر رہے تھے۔ یہاں تو کوئی بھی نہیں تھا؟"

"میں نے میر تقی میر کی روح کو بلایا تھا۔ انہی سے باتیں کر رہا تھا۔ واہ بھئی واہ! جیسا کلام ہے ویسے ہی باتیں کرتے ہیں۔ دل شکستہ ہیں مگر ہیں بڑے دلچسپ۔"

"مجھے تو کوئی بھی نظر نہیں آتا۔"

"روحیں کہیں ہر ایک کو نظر آتی ہیں۔ اور تم میرے معاملات میں دخل مت دیا کرو۔ تم اپنی جورو کے ساتھ خوش رہو۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو" آزاد نے کہا "اور ہاں، اب تم یہاں سے جاؤ۔ مجھے ابھی سودا کی روح کو بھی بلانا ہے۔"

آغا ابراہیم کیا کرتا۔ وہاں سے اٹھ کر چلا آیا۔ اب وہ ہر روز کسی نہ کسی روح کو بلاتے اور جھک جھک کر سلام کرتے۔

جب یہ حالت ہو تو نوکری کیسے برقرار رہ سکتی تھی۔ محکمے نے اسے دیوانہ قرار دے کر جبری ریٹائر کر دیا اور گورنر جنرل کی تحریک پر اس کی پنشن منظور ہو گئی۔

ایک ملازمت کا کانٹا تھا، وہ بھی نکل گیا۔ اس دوران میں علاج معالجے بھی ہوتے رہے لیکن اس کا مراق، جنون میں تبدیل ہوتا چلا گیا۔

ایک دن عالم بے قراری میں وہ سید دھیان شاہ کے پاس جا نکلا۔ ابھی چند قدم کا فاصلہ تھا کہ درویش نے نظر اٹھا کر دیکھا۔

"جا محمد حسین جا۔ تیرے لیے دہلی کا حکم آیا ہے۔ دلی چلا جا۔"

خدا جانے اس حکم میں کیا تاثر تھا۔ ایک بجلی تھی جس نے صبر و سکون، ہوش و حواس، تمدن و وضع داری، علمیت سب کو خاک سیاہ میں تبدیل کر دیا۔ کوچۂ رسوائی کو کوچۂ محبوب نظر آنے لگا۔ وہ الٹے قدموں لوٹا اور پیدل ہی دلی کی طرف چل دیا۔

کہاں لاہور کہاں دلی۔ جنگل بیابانوں سے گزرتا ہوا اس حال میں دلی پہنچا کہ سر سے پگڑی غائب، پیر میں جوتا ندارد، کپڑے تار تار، پاؤں میں آبلے، ہاتھ زخمی۔ پیٹ کمر سے لگا ہوا۔ شور مچ گیا کہ شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد اس حال میں وارد ہوئے ہیں۔ جس راہ سے گزرتا تھا، ایک خلقت اسے دیکھنے آتی تھی اور انگشت بدنداں تھی۔

رشتے داروں کو پتا چلا۔ وہ اسے ڈھونڈنے کے لیے نکلے۔

"ابھی تو یہیں تھے۔ قدم شریف کی طرف گئے ہیں۔"

وہاں کسی نے بتایا' استاد ذوق کی قبر پر ملیں گے۔ بہ ہزار دقت وہ ایک جگہ ملا۔ کچھ شریر بچے اس کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

رشتے داروں کو یقین نہ آتا تھا لیکن جب آنکھوں سے دیکھا تو بے اختیار آنسو رواں ہو گئے۔

"محمد حسین' یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔ چلو گھر چلو۔ ہم تمہاری خدمت کریں گے۔ کیوں تماشا بنے ہوئے ہو۔"

وہ لوگ منت سماجت کرتے تھے مگر وہ کب کسی کی سنتا تھا۔ اس نے ایک نگاہ غلط انداز سب پر ڈالی اور آگے بڑھ گیا۔

"خدا کے واسطے محمد حسین' گھر چلو۔"

"سب مجھے تنگ کرتے ہیں۔ دسترخوان گھسیٹ لیتے ہیں۔ کھانے میں زہر ملاتے ہیں۔ میری بہو جسے میں بیاہ کر لایا تھا' میری سب سے بڑی دشمن ہے۔"

"تم ان سے مت ملنا مگر ہمارے ساتھ تو چلو۔"

"تم بھی تو انہی کے رشتے دار ہو۔ ہٹ جاؤ میرے راستے سے" آزاد نے باقاعدہ بھاگنا شروع کر دیا۔ بچے بھی اس کے ساتھ بھاگنے لگے۔

رشتے دار مایوس ہو کر لوٹ آئے کہ پھر کسی وقت سمجھا لیں گے۔

وہ اپنے رشتے داروں سے جان چھڑا کر بھاگا اور سیدھا قطب صاحب پہنچ گیا۔ وہاں سے نظام الدین اولیا کی درگاہ پر پہنچ گیا۔ لنگر تقسیم ہو رہا تھا۔ وہ بھی فقیروں میں فقیر بن کر کھڑا ہو گیا۔ کئی دن سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ جو کچھ لنگر کے نام پر ملا' ایک طرف بیٹھ کر خوب سیر ہو کر کھایا۔ اس مست کا دل یہاں بھی نہیں لگا۔ وہاں سے بھی چل کھڑا ہوا۔ دلی سے باہر نکل گیا۔ دور تک جنگل ہی جنگل تھا۔ تھک گیا تھا۔ پاؤں پھیلا کر سو گیا۔ رات سے پہلے سو گیا تھا۔ رات آئی اور گزر گئی۔ دن نکلا تو پھر اس نے شہر کا رخ کیا۔

کئی دن اسی طرح گزر گئے۔ کبھی شہر کبھی جنگل جہاں اس کا جی لگتا' وہاں پہنچ جاتا۔ بھوک لگتی تو کسی دکان سے مٹھی بھر چنے اٹھا لیتا۔ لوگ مٹھائیاں پیش کرتے مگر وہ آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا۔

وہ دلی میں تھا ادھر لاہور میں گھر والے پریشان تھے کہ دیوانگی میں نہ جانے کدھر نکل گئے۔ پورا لاہور چھان مارا کہیں نظر نہ آئے۔ آخر دلی سے تار آیا کہ آزاد یہاں ہیں۔ گھر میں کہرام مچ گیا۔ آغا ابراہیم فوراً دلی پہنچے۔ ان کے ساتھ بھی وہی ہوا جو دیگر رشتے داروں کے ساتھ ہوا تھا۔ بہت سمجھایا کہ گھر چلئے مگر ایک نہ مانی۔

آغا ابراہیم کتنے دن دلی میں ٹھہرتے۔ ملازمت سے مجبور تھے لہٰذا آزاد کو اس کے حال پر چھوڑ کر واپس آ گئے۔

یہ دیوانہ کئی مہینے اسی طرح گھومتا رہا۔ آخر جذبہ سکون کی طرف مائل ہونے لگا۔ کبھی کبھی پرانے دوستوں کی طرف جا نکلتا۔ اب اس کی کیفیت دھیان شاہ والی تھی۔ کبھی سالک کبھی مجذوب' کبھی پُرسکون کبھی وحشت زدہ۔ دوستوں کے پاس بیٹھ کر ادبی نکات پر طویل بحثیں کرتا۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے تمام علوم اُس کے ذہن میں سما گئے ہیں۔ اسی دوران میں دورہ سا پڑتا اور اٹھ کھڑا ہوتا۔

اب اس کی ایسی حالت تھی کہ اسے سمجھایا جا سکتا تھا چنانچہ اس کے بچپن کے دوست منشی ذکاء اللہ بہلا پھسلا کر اسے اپنے دولت کدے پر لے آئے۔ شیشے کے برتن کی طرح اس کی حفاظت کی۔

ایک وہی نہیں' پورا گھر اس کی ناز برداریوں میں لگا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی حکیم محمود خاں کا علاج بھی ہو رہا تھا۔ اسے یہ فرق پڑا کہ ہوش مندی کے وقفے بڑھنے لگے۔ رفتہ رفتہ طبیعت نے بہت کچھ قرار پکڑ لیا۔ ایک مرتبہ پھر دوستوں کی محفلیں آباد ہونے لگیں۔

ایک سال تک منشی ذکاء اللہ نے اس کی ناز برداری کی۔ دوستی کا حق ادا کر دیا۔ اب آزاد کا یہاں جی گھبرانے لگا تھا۔ اس کے مرض کا تقاضا تھا کہ اس کے ساتھ زبردستی نہ کی جائے لہٰذا آغا ابراہیم کو خط لکھا گیا۔ وہ آئے اور آزاد کو اپنے ساتھ لاہور لے گئے۔

آزاد کو بہو کے ساتھ رہنا گوارا نہیں تھا لہٰذا اپنے الگ مکان میں رہے۔ آس پاس الماریوں میں کتب خانہ سجا دیا۔ درمیان میں پلنگ۔ ایک گوشے میں چھوٹا سا بوریا' اس پر فرش' کاغذ قلم سب کچھ پاس رکھ کر بیٹھتا۔ صبح شام وہی پہنا۔ چار پانچ میل سیر کو جنگل یا باغوں میں جاتا جہاں ہر پتا اس کا مخاطب تھا۔ ہر درخت اس سے باتیں کرتا تھا۔ نسیم کا ہر جھونکا' اس کے لیے نئی خبریں لاتا۔ غرضیکہ صبح و شام کی تفریح اس کی زندگی تھی۔ اب اس نے اپنے اردگرد صفحات بھی پھیلا لیے تھے۔ رات رات بھر کاغذ رنگین کرتا تھا اور انہیں سنبھال کر رکھتا جاتا تھا۔ یہ اس کی نئی تصنیفات تھیں۔ مکاشفات آزاد۔ فلسفہ الہیات' جانورستان' ترکی قواعد' عربی

قواعد وغیرہ۔

احباب کو خوشی تھی کہ دماغ ٹھکانے آیا۔ تھوڑی بہت آشفتگی ہے وہ بھی جاتی رہے گی۔

ایک روز مولوی خلیل الرحمٰن دفتر جا رہے تھے کہ آزاد دور سے آتے ہوئے نظر آئے۔ مولانا پریشان ہوئے کہ عرصہ دراز سے نہیں ملا ہوں دیکھئے کیا سخت سست سناتے ہیں۔ آزاد کی ذہنی کیفیت سے وہ یوں بھی خائف تھے۔ مولانا نے بچنا چاہا لیکن آزاد نے دیکھ لیا۔ خیریت پوچھی۔ ایک ایک بچے کی تعلیم کے بارے میں پوچھتے رہے۔

مولانا خلیل الرحمٰن کی شامت آئی تھی کہ ازراہِ ادب اس سے کہہ بیٹھے۔

"آپ کی بہت دنوں سے زیارت نہیں ہوئی۔"

بس پھر کیا تھا۔ آزاد کو موقع مل گیا اور مولانا پر برس پڑے۔

"تو ایسا بے ایمان پاجی ہے۔ تو نے میری خبر بھی نہیں لی۔ میرے اوپر کیا کیا بن گئی' تو نے کروٹ نہیں لی۔ پاجی پوچھتا ہے بہت دنوں سے زیارت نہیں ہوئی۔ خبر بھی ہے میرے ساتھ کیا دغا ہوئی؟"

"خیریت؟ کیا ہو گیا؟"

"میرے ساتھ ذکاء اللہ نے پھر دغا کی۔ اس کی۔۔۔" آزاد نے گالی دی "میں ایک روز ہوا خوری میں دہلی پہنچ گیا۔ ذکاء اللہ نے بڑی خاطر سے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنے مکان میں ٹھہرایا' مجھے کیا معلوم اس کے دل میں دغا ہے۔ اس کے مکان کے نزدیک ایک برات آکر ٹھہری۔ مجھ سے کہنے لگے' آزاد! تو بھی برات دیکھ آ' میں گیا۔ برات والوں نے جو مجھے دیکھا تو شور مچایا کہ آزاد آیا' آزاد آیا۔ مجھے بڑی خاطر سے دولھا کے پاس بٹھا دیا۔ مجھے کیا خبر ذکاء اللہ نے اس کی۔۔۔ کیا فریب کیا ہے۔ اب جو نکاح بندھنے لگا تو نکاح اور مہر کے ساتھ مجھے بھی باندھ دیا اور ایسا جکڑا کہ رسوں کے بندھنوں سے اب تک میرے بدن میں درد ہے۔ جس طرح ہو سکا میں رسوں کو تڑا ابھی چلا آ رہا ہوں۔"

ایسا کوئی واقعہ نہیں تھا۔ یہ سب آزاد کی ذہنی اختراع تھی۔ اس کی فطرت میں داستان طرازی تھی' اس کی دیوانگی سے مل کر عجیب و غریب رنگ اختیار کر گئی تھی۔ کبھی کسی کو خضر علیہ السلام سے اپنی ملاقات کا احوال سناتا تھا۔ کبھی خود کو راجا جے چند کا اوتار کہتا تھا۔

مولانا خلیل الرحمٰن نے بھی جب منشی ذکاء اللہ سے منسوب واقعہ اس کی زبان سے سنا تو انہیں شک ہوا کہ آزاد ٹھیک نہیں ہوئے ہیں۔ ان کا مرض کسی وقت بھی شدت اختیار کر سکتا ہے۔ یہی ہوا' آزاد ایک مرتبہ پھر لاہور سے غائب ہو گیا۔ اس مرتبہ اس کا رخ علی گڑھ کی طرف تھا اور وہ بھی پیدل۔ پیروں پر ورم آ چکا تھا۔ آبلوں پر کپڑے پھاڑ کر دھجیاں لپٹی ہوئی تھیں۔ جب سرسید کی کوٹھی پر پہنچا تو نوکروں سے اطلاع کرائی کہ سید احمد سے کہہ دو' تمہاری ملاقات کے لیے آزاد لاہور سے آیا ہے۔

آزاد کا نام سنتے ہی سرسید گھبرا کر باہر نکلے۔ دیکھا تو واقعی شمس العلما آزاد ہیں۔ دیوانگی کے قصے وہ سن ہی چکے تھے' اب دیکھ بھی رہے تھے۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے اور آبگینے کی طرح سنبھال کر اسے اندر لائے۔

"سید! یہ بھی جانتے ہو' میں یہاں کیوں آیا ہوں؟" آزاد نے کرسی پر بیٹھتے ہی کہا۔

"ظاہر ہے' محض مجھ سے ملنے کے لیے آپ نے یہ تکلیف اٹھائی ہے۔"

"نہیں۔ اس سے بھی ایک خاص بات ہے۔ ذرا غور سے سننا۔ کئی دن ہوئے ابوالفضل کی روح میرے پاس آئی تھی۔ میرا اور ابوالفضل کا اکبر کے مذہبِ الٰہی پر دیر تک مناظرہ ہوا۔"

آزاد نے کرسی سے کھڑے ہو کر اس مناظرے کی تفصیلات سنانی شروع کیں۔ اول ابوالفضل کی تقریر فارسی میں سناتا تھا۔ پھر اپنا جواب سناتا تھا۔ اسی عالمِ جنوں میں وہ جیسی بے مثال فارسی بول رہا تھا اور جو نکتے بیان کر رہا تھا' اسے سن کر سرسید دم بخود تھے اور افسوس کر رہے تھے کہ کیسا بے مثال دماغ' دیوانگی کے ہاتھوں تباہ ہو گیا۔ یہ شخص تمام زندگی تجربات جمع کرتا رہا۔ نادر کتابوں کے مطالعے میں ایک عمر لگا دی اور اب اس علم کو ظاہر کرنے کا وقت آیا تھا کہ اپنے ہوش ہی میں نہیں رہا۔ اب اس کی باتیں دیوانے کی بڑ ہیں۔ افسوس' صد ہزار افسوس۔

دیوانے کو سمجھانے والا بھی دیوانہ۔ سرسید نے بھی اس دیوانے کو سمجھانے کے بجائے' ایک ہفتے تک اپنا مہمان بنا کر رکھا۔ جب اس کے پاؤں کے آبلے کچھ اچھے ہو گئے تو اپنے ایک ملازم کے ساتھ اسے لاہور بھیج دیا۔

وہ دلی اور علی گڑھ تک پیدل ہو آیا تھا۔ یہ خطرہ روز بہ روز بڑھتا جا رہا تھا کہ کہیں وہ کسی ایسی طرف نہ نکل جائے کہ واپس نہ آ سکے یا کسی حادثے سے دوچار ہو جائے۔ دماغ کی خرابی تھی کہ روز بہ روز بڑھتی جا رہی تھی۔ بیٹے کی محبت نے جوش مارا اور اسے کسی بہانے سے پاگل خانے میں داخل

کرادیا کہ شاید ڈاکٹر مناسب علاج کرا سکیں لیکن ایک روز وہ ان سے ملنے گیا تو ان کی حالت دیکھی نہ گئی جس باپ نے اسے نازوں سے پالا تھا' اسے بجلی کے جھٹکے دیے جارہے تھے اور وہ بری طرح چیخ رہا تھا۔ وہ اسے واپس گھر لے آیا۔

ادھورے علاج کا اثر تھا یا کیا تھا کہ پاگل خانے سے آنے کے بعد اس کی حالت مزید بگڑ گئی۔ صاف نظر آرہا تھا کہ رفتہ رفتہ ہوش و خرد سے بالکل ہی بے گانہ ہوجائے گا۔ مکان کو اندر سے بند کرکے بیٹھا رہتا۔ لکھنے کا سلسلہ اس عالم میں بھی جاری تھا۔ ہر تحریر نہایت خوش خط' دیدہ زیب لکھتا تھا۔ عنوانات سرخ روشنائی سے لکھتا تھا۔ جلد کی پیشانی پر جلی حروف میں کتاب کا نام۔ جب کتاب مکمل ہوجاتی تو نہایت احتیاط سے ڈوری میں باندھ کر بکس میں بند کردیتا۔ یہ بھی عجیب بات تھی کہ اب وہ زیادہ تر عربی زبان میں لکھ رہا تھا۔

جیسے جیسے اس کی حالت بگڑتی جارہی تھی' احباب کا تقاضا بڑھتا جارہا تھا کہ "دربارِ اکبری" کو اب شائع ہوجانا چاہیے۔ یہ وہی کتاب تھی جس کے لیے سید حسن بلگرامی نے کہا تھا کہ یہ کتاب آپ کے نام کو زندہ رکھے گی۔ آزاد نے جس ذوق و شوق سے اس دربار کو سجایا تھا اور جس جگر کاوی سے اسے مکمل کیا تھا اس کا تقاضا بھی یہی تھا کہ اسے شائع ہونا چاہیے۔ آخر آغا ابراہیم نے ہمت کرکے آزاد سے اس کی اشاعت کے بارے میں بات کی۔ آزاد کبھی اس کی اشاعت کے خواب دیکھا کرتا تھا' اس لیے امید تھی کہ وہ خوش ہوگا لیکن خیر ہو دیوانگی کی کہ وہ سنتے ہی بھڑک اٹھا۔

"ہرگز نہیں۔ میں ہرگز پسند نہیں کروں گا کہ اکبر جیسے اولوالعزم بادشاہ کی زندگی ہر کس و ناکس کے ہاتھ میں جائے اور چند سکوں کے عوض بازاروں میں بکتی پھرے۔"

"کتابیں تو لکھی ہی اس لیے جاتی ہیں کہ شائع ہوں اور لوگ انہیں پڑھ کر فائدہ اٹھائیں۔"

"میری اور کتابوں سے کتنا فائدہ اٹھالیا جو اس سے اٹھائیں گے۔ اب چلے جاؤ' مجھے مت چھیڑو۔ میں اس کی ہوا بھی نہیں لگنے دوں گا۔ میری محنت سے تم نکے کمانا چاہتے ہو۔ اس کتاب میں ابوالفضل کی روح بند ہے۔ خان خاناں کی روح بند ہے۔"

"اچھا' ایک نظر مسودہ دکھا تو دیجیے۔ دیکھوں تو محفوظ بھی ہے۔"

"ہوشیار بنتے ہو' مجھے دیوانہ سمجھا ہوا ہے۔ میں تمہیں مسودہ دکھاؤں اور تم جھپٹ لو۔ غور سے سنو! اگر تم نے زیادہ ضد کی تو میں اس مسودے کو راوی میں پھینک آؤں گا۔"

آغا ابراہیم ڈر گئے کہ زیادہ ضد کرنا مناسب نہیں۔ ان کا کیا بھروسا کہیں یہ ایسا کر ہی نہ گزریں۔

اس کے بعد بھی کئی دوستوں نے کوشش کی لیکن وہ تیار نہیں ہوتا تھا بلکہ اتنا محتاط ہوگیا تھا کہ کسی کو کتب خانے میں قدم بھی نہیں رکھنے دیتا تھا۔

اب ایک ہی راستہ تھا۔ وہ ہوا خوری کے لیے نکلا اور اس کی غیر موجودگی میں مسودہ حاصل کرلیا گیا۔

وہ شاید ہر روز اسے دیکھتا تھا۔ ہوا خوری سے واپس آنے کے بعد مسودے کو غائب پایا تو رہا سہا ہوش بھی جاتا رہا۔ دیوانوں کی سی حالت طاری ہوگئی۔ نہ کچھ کھاتا تھا نہ پیتا تھا۔ گھنٹوں میں سر دیے بیٹھا رہتا تھا۔ کسی کی ہمت نہیں تھی کہ اس سے ملنے چلا جاتا۔ کسی نہ کسی طرح کھانا پہنچادیا جاتا تھا ورنہ وہ سب سے قطع تعلق کرچکا تھا۔

حمایت اسلام کے جلسے میں لیکچر دینے کے لیے مولوی نذیر احمد لاہور آئے ہوئے تھے۔ آزاد سے ملنے کے مشتاق تھے۔ کئی مرتبہ ملنے آئے لیکن آزاد نے ملنا تو درکنار دروازہ بھی نہیں کھولا۔ مولوی نذیر احمد ہر مرتبہ کفِ افسوس ملتے ہوئے واپس چلے گئے۔

ایک دن اس کے جی میں نہ جانے کیا آئی کہ اسی دیوانگی کی حالت میں گھر سے نکلا اور وہاں پہنچ گیا جہاں ڈپٹی نذیر احمد ٹھہرے ہوئے تھے۔ دونوں ہم مکتب تھے۔ بچپن کے دوست تھے۔ گلے مل کر خوب آنسو بہائے۔ گلے شکوے ہوئے۔ دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ کبھی سلجھی ہوئی کبھی الجھی ہوئی۔

اسی اثنا میں ڈپٹی نذیر احمد نے اپنا لیکچر اس کے سامنے رکھ دیا۔

"یہ لیکچر مجھے جلسے میں پڑھنا ہے۔ اگر ایک نظر تم بھی دیکھ لو تو اطمینان ہوجائے۔"

آزاد نے لیکچر پڑھنا شروع کیا۔ ساتھ ہی ساتھ ترمیم و اضافے بھی کرتا جاتا تھا۔ ایک گھنٹے میں..... اس نے پورا لیکچر دیکھ لیا۔ کوئی صفحہ ایسا نہیں تھا جو ترمیم و اصلاح سے خالی رہا ہو۔

"بھئی' نذیر احمد! تم اردو لکھنا بھول گئے ہو" یہ کہا اور اٹھ کر چل دیا۔ نہ سلام نہ دعا۔

ڈپٹی نذیر احمد حیرت سے اسے جاتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ اس دیوانگی میں بھی ذہن کی برق رفتاری کا یہ عالم ہے۔

شب و روز اس کے نام کا ماتم کرتے ہوئے گزر رہے تھے۔ کبھی حالت بگڑ جاتی کبھی سنبھل جاتی۔ شاید سنبھل ہی جاتی لیکن ایک ٹھوکر اور لگی۔ اس کی اہلیہ کا انتقال ہوگیا۔

اپنی دیوانگی میں وہ اس سے بھی لاتعلق ہو گیا تھا لیکن اس کے مرنے کا سنا تو اچانک محبت جاگ اٹھی۔ وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کے رویا۔ ننگے پاؤں اس کے جنازے کے ساتھ ساتھ گیا اور دفن کر کے چلا آیا لیکن اس دن کے بعد سے وہ یوں چپ ہو گیا جیسے بیوی کے ساتھ خود دفن ہو گیا ہو۔

وہ اسے اپنے ہاتھوں سے دفن کر کے آیا تھا لیکن اسے یقین نہیں آتا تھا کہ وہ مر چکی ہے۔ پورے گھر میں اسے آوازیں دیتا پھرتا تھا۔ جب تھک جاتا تو ایک کونے میں سر جھکا کر بیٹھ جاتا۔ نہ سردی کا ہوش تھا نہ گرمی کا۔ اب گویا بالکل ہی پاگل ہو چکا تھا۔

بیوی کے انتقال کو تھوڑی ہی مدت ہوئی تھی کہ ایک دن دروازے پر کہار ڈولی لے کر آئے۔ کہاروں نے آواز لگائی۔

"محمد حسین کو توال کے گھر سے سواری آئی ہے۔"

آزاد مردانہ مکان میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کوتوال تو سنا نہیں، اس نے صرف محمد حسین سنا۔ وہ اپنے مکان سے نکلا اور تیز رفتاری سے زنانہ مکان میں داخل ہوا۔ وہ خاتون جو ڈولی میں بیٹھ کر آئی تھیں، ابھی صحن ہی میں تھیں کہ آزاد بیوی، بیوی کہتے ہوئے ان کے پیچھے بھاگا۔ وہ بے چاری اس اچانک افتاد سے حواس باختہ ہو گئیں۔ اب یہ حال تھا کہ وہ پورے صحن میں بھاگتی پھر رہی تھیں اور آزاد انہیں پکڑنے کے لیے ان کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔

گھر کی عورتیں اسے سمجھا رہی تھیں کہ تمہاری بیوی تو مر گئی ہیں۔ یہ تو محمد حسین کوتوال کی بیوی ہیں لیکن وہ بضد تھا کہ سب غلط کہہ رہے ہیں۔ یہ تو میری بیوی ہیں، میں ان کی شکل ضرور دیکھوں گا۔ اتنے میں وہ خاتون پلنگ کے نیچے گھس گئیں۔ یہ بھی پلنگ کے نیچے چلے گئے۔ وہ دوسری طرف سے نکل کر دوسرے پلنگ کے نیچے چھپ گئیں۔ سب سمجھاتے رہے مگر انہوں نے کسی کی ایک نہ سنی۔ ان کو زبردستی پلنگ کے نیچے سے نکالا اور شکل دیکھی۔ صورت دیکھ کر لاحول پڑھی۔

"یہ تو واقعی وہ نہیں ہیں۔ وہ تو واقعی مر چکی ہیں" یہ کہتے ہوئے اپنے مکان میں آ گیا۔

اس کی زندگی اس قسم کے سیکڑوں واقعات کا مرقع بن کر رہ گئی تھی۔ طرح طرح کی وارداتیں دل پر گزرتی تھیں۔ ان وارداتوں کو تصنیفات کے نام پر کاغذوں پر اتارتا جا رہا تھا۔ دوستوں کو خط لکھتا تھا اور اپنے پاس رکھتا جاتا تھا۔

بہت دنوں سے اس کی کوئی خبر نہیں آئی تھی۔ دلی میں سب احباب فکر مند تھے۔ آخر نا صر نذیر فراق کو خیال آیا کہ

ماخذات

محمد حسین آزاد (حیات و تصانیف) از ڈاکٹر اسلم فرخی۔
وسط ایشیا کی سیاحت، آغا محمد اشرف۔
سیر ایران، آزاد۔

ایک بار لاہور چل کر مولانا کی زیارت کر لو۔ ایسا نہ ہو، خدانخواستہ اس جہان سے رخصت ہو جائیں اور یہ آنکھیں آخری دیدار سے محروم رہ جائیں۔

وہ دلی سے لاہور آئے اور انارکلی، محمد شفیع کی سرائے میں ٹھہرے۔ ایک دن آرام کرنے کے بعد وہ اکبری دروازے، آزاد کی دولت سرا پر پہنچ گیا۔ یہ سوچ کر ہی دل دھڑک رہا تھا کہ شمس العلما آزاد کے نام پر وہ ایک خبط الحواس بوڑھے سے ملے گا کیا خبر وہ اسے پہچانے بھی یا نہیں۔

آزاد کا پوتا گھر سے باہر آیا۔ ناصر نذیر فراق نے اپنا مدعا بیان کیا۔

"آپ کے دادا جان کی قدم بوسی کے لیے دلی سے آیا ہوں۔"

"امام باڑے میں بیٹھے کھانا کھا رہے ہیں۔ آیئے، میں آپ کو لے چلوں۔"

وہ دونوں ساتھ ساتھ گئے۔ آزاد امام باڑے کے برآمدے میں بیٹھے تھے اور جس حالت میں بیٹھے تھے، اسے دیکھ کر کلیجا منہ کو آتا تھا۔ ایک میلی سی اچکن گلے میں تھی جس کی چولی میں پورے بٹن نہیں تھے۔ ایسا ہی میلا کچیلا ڈبل زین کا پاجامہ تھا۔ سر پر مغلئی وضع کی ٹوپی جس پر انگل انگل بھر میل چڑھا ہوا تھا اور پاؤں میں بہت ہی بوسیدہ جوتی تھی۔ ایک بوریے پر بیٹھے تھے۔ ایک مٹی کی رکابی میں شوربا تھا اور ایک چنگیر میں چپاتیاں تھیں۔ چپاتی کا نوالہ بنا کر شوربے میں ڈبوتا تھا اور منہ میں رکھ لیتا تھا اور دیر تک چبا کر مشکل سے حلق سے نیچے اتارتا تھا۔

اپنی تصنیف آب حیات میں اس نے انشاء اللہ خاں انشا کے آخری دور کا بیان کرتے ہوئے انشا کے بارے میں لکھا تھا۔

"دیکھا کہ ایک کونے میں تن برہنہ۔ دونوں زانوؤں پر سر دھرا ہے۔ آگے راکھ کے ڈھیر ہیں۔ ایک ٹوٹا سا حقہ پاس رکھا ہے۔"

آج خود اس کا یہی حال تھا۔ ادھر ادھر کچھ راکھ کچھ کوئلے اور کچھ کوڑا پڑا تھا۔

"بھئی، تم کون ہو؟" آزاد نے ان کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"میں ناصر نذیر فراق ہوں۔"

"میں تمہیں نہیں جانتا۔"

"میں آپ کا شاگرد ہوں۔"

"اچھا! اگر تم میرے شاگرد ہو تو گرما گرم جلیبیاں تو لے آؤ۔"

ناصر نذیر بھاگ کر گئے اور جلیبیاں لے کر آگئے۔ گرم جلیبیاں ہر وقت تو ملتی نہیں، ٹھنڈی تھیں۔ آزاد نے ایک جلیبی اٹھا کر منہ میں رکھی اور تھوک دی۔

"میرے پلتے ہوئے دانتوں سے یہ ٹھنڈی جلیبیاں کہاں چبائی جائیں گی، انہیں اٹھالو۔"

وہ اصرار کرنے لگے تو آزاد بگڑ گئے "اب آپ یہاں سے چلے جائیں اسی میں خیریت ہے۔"

آزاد کے پوتے نے بھی کہا کہ اس وقت ان کے سامنے سے ہٹ جائیں ورنہ اور بگڑیں گے۔

"میاں، تم ان کا خیال نہیں رکھتے۔ یہ کس حالت میں بیٹھے ہوئے ہیں؟" ناصر نذیر نے کہا۔

"حضرت، گور کا حال مردہ ہی خوب جانتا ہے۔ اگر دسترخوان میں روٹی لائی جاتی ہے تو دسترخوان جلادیتے ہیں۔ چینی کی رکابیوں میں سالن دیا جاتا ہے تو توڑ کر پھینک دیتے ہیں۔ تانبے کی رکابیاں دیجئے تو بازار میں جاکر بیچ آتے ہیں۔ اچھے کپڑوں سے تو دشمنی ہے۔ ادھر پہنائے ادھر پھاڑے۔ ہم کہاں تک خیال رکھیں۔"

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ دیکھا آزاد، دانتوں میں خلال کرتے ہوئے چلے آرہے ہیں۔

"ہیں! بھئی، تم کب دلی سے آگئے" آزاد نے ناصر نذیر سے کہا "واللہ! میں نے تمہیں اس وقت نہیں پہچانا تھا" یہ کہہ کر تخت پر بیٹھ گئے۔

"آپ نے مجھے پہچان لیا؟"

"ہاں میاں، تمہارا نام سید ناصر نذیر ہے۔ ہے نا یہی نام؟"

"بے شک آپ نے سچ مچ مجھے پہچان لیا۔ ایک تازہ سلام کہا ہے۔ کہیں تو آپ کو سناؤں؟"

"پڑھو۔"

ناصر نذیر نے سلام پڑھنا شروع کیا۔ جو شعر پسند آتا تھا اس پر داد دیتے تھے، جو پسند نہ آتا تو فرماتے یہ کچھ نہیں۔

سلام ختم ہونے کے بعد دیر تک باتیں کرتے رہے پھر اچانک اٹھے اور بازار کی طرف چل دیے۔ پلٹ کر بھی نہیں دیکھا کہ کوئی مہمان آیا تھا۔

اس کی زندگی کے بیس سال اسی مجبوری اور بے چارگی کے عالم میں گزر گئے۔ آخر وہ وقت بھی آگیا جب دوائیں بے کار اور تدبیریں ضائع ہو جاتی ہیں۔

۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء کو عاشورے کی شب میں آزاد بھی قیدِ جنوں سے آزاد ہو کر مالک حقیقی سے جا ملے۔

انتقال کی خبر پھیلتے ہی عقیدت مند جمع ہونا شروع ہو گئے۔ صبح کو عاشورہ تھا اس لیے قرار پایا کہ اس دن دفن نہ کیا جائے۔

تیسرے دن جنازہ اٹھا۔ پورا شہر جنازے پر امڈ آیا تھا۔ تمام سرکاری دفاتر اور سرکاری و غیر سرکاری مدارس بند ہو گئے۔

داتا گنج بخشؒ کے مزار کے قریب گامے شاہ میں جسے کربلا کہتے ہیں، اسے دفن کر دیا گیا۔

آزاد کے بیٹے آغا محمد ابراہیم نے مقبرہ بنوایا جس پر سونے کا کلس لگوایا۔

مقبرے کے باہر یہ کتبہ لگا ہوا ہے۔

ہوالعلی الاعلی

مقبرہ آزاد

از مآثر نیات آغا محمد ابراہیم ابن شمس العلما

مولوی محمد حسین آزاد رحمتہ اللہ

یکم رجب ۱۳۲۸ھ

اور قبر پر یہ عبارت کندہ ہے۔

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

علی وصی اللہ وصی رسول اللہ

انتقال کے بعد اس کے مسودے تلاش کیے گئے۔ نو اسی مسودے ہاتھ لگے جو انہوں نے عالمِ جنوں میں لکھے تھے۔ نہایت خوش خط میں تحریر کیے گئے تھے۔ ان مسودوں کو دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ عالمِ جنوں کی یادگاریں ہیں۔ البتہ چند صفحے پڑھ کر یہ یقین پختہ ہو جاتا تھا۔ ایک بات لکھتے لکھتے اچانک کوئی اور بات لکھنے لگتے تھے۔ ذہنی رو تھی جس کے ہاتھوں وہ کھیل رہے تھے۔

اُردو ادب میں تو کیا، عالمی ادب میں بھی ایسی مثال نہیں مل سکتی کہ کسی ادیب نے ایسی ذہنی پراگندگی میں اتنی صحت مند زبان لکھی ہو۔

یوں پھریں اہلِ کمال آشفتہ حال افسوس ہے
اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے

(ذوق)

■■■